حکومت کا مستحق کون؟

یاد رہے کہ میں اس بات کو ضروری سمجھتا ہوں کہ عظمت و اقتدار اہلِ دین اور اصحاب خلوص کے ہاتھ ہو جن کی زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کا پورا نظام نمایاں ہو جو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی پر یقین رکھتے ہوں کہ ہم سے ہمارے ہر عمل کا جواب طلب کیا جائے گا۔ جو لوگ کنتم خیر امة الخ کا صحیح مصداق ہوں اور اوامر و نواہی کا پوری صدق دلی سے نفاذ کر سکیں اور وہ لوگ ایسے ہوں جن سے خلقِ خدا کو بلا امتیاز مذہب و ملّت انصاف مل سکے اور وہ لا یجرمنکم شنان قوم الخ کی چلتی پھرتی تصویر ہوں۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی
رحمہ اللہ تعالےٰ

احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

محمد سعید الرحمٰن علوی

(۲۰)

مرویاتِ معاویہ رضی اللہ عنہ

أخرج الكلاباذي أنّ
رجلاً سأل معاوية رضي الله
تعالىٰ عنه عن مسئلة فقال سل
عليًّا هو أعلم منّي فقال
أريد جوابك قال ويحك
كرهت رجلاً كان رسول الله
صلى الله تعالىٰ عليه واصحابه
وسلم يغرّه بالعلم غرًّا و
قد كان أكابر الصحب
يعترفون له بذالك وكان
عمر (رضي الله تعالىٰ عنه) يسأله
عمّا أشكل عليه (فيض القدير ص۴۶ ج۳)

ترجمہ: ایک شخص نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کسی مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے اسے ہدایت فرمائی کہ تم حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مسئلہ پوچھو۔ سائل نے عرض کیا کہ میں آپ کا جواب چاہتا اور پسند کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ تیرا برا ہو تو ایسے شخص کو ناپسند کرتا ہے جس کی عزت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ و اصحابہ وسلم اس کے علم کی وجہ سے کرتے تھے۔

اور بڑے بڑے صحابہ ان کی اس خوبی کے معترف تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشکل ترین مسائل انہی سے دریافت فرماتے۔

صحابہ علیہم الرضوان کی عظمت و بزرگی پر قرآن کی دسیوں آیات اور سرور کائنات علیہم السلام کے ان گنت ارشادات شاہد ہیں۔ قرآن نے انہیں "اشداء علی الکفار رحماء بینھم" فرمایا اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی عملی زندگیاں اسی حقیقت کا مظہر تھیں۔ تاہم بعض واقعات ان حضرات کے یہاں اس قسم کے پیش آئے جنہیں دیکھ سن کر ایک عام آدمی پریشان سا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے واقعات میں حضور علیہ السلام کے داماد شہید کوفہ، حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اور آپ کے "صاحب سر" کاتب وحی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا باہمی اختلاف بھی ہے۔ اس اختلاف کا انکار کسی طرح ممکن نہیں، اختلاف ہوا اور ضرور، اور اس اختلاف نے خاصی سنگین صورت اختیار کر لی لیکن آپ دیکھیں اختلاف کے باوجود کتنا احترام ہے اور دوسرے کے لئے دل میں کتنی قدر و منزلت ہے۔ کہ سائل حضرت معاویہؓ سے مسئلہ پوچھتا ہے وہ یقیناً مسئلہ بتا سکتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی علم کی دولت سے سرفراز فرمایا تھا۔ انہیں بھی نبی پاکؐ کی صحبت سے مشرف فرمایا تھا۔ وحی کی کتابت کا اعزاز انہیں حاصل ہوا۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو "حبر امت" اور "ترجمان القرآن" تھے ان کا حضرت معاویہؓ سے متعلق اعتراف موجود ہے کہ وہ "فقیہ" تھے۔ لیکن آپ نے سائل کی اصلاح کی غرض سے اور ان حالات کے پیشِ نظر اسے توجہ دلائی کہ مجھ سے علمی دنیا میں عظیم شخصیت حضرت علیؓ کی ہے۔ حضور علیہ السلام کے یہاں انہیں ان کے علمی شرف و مجد کی بناء پر عزت حاصل تھی۔ صحابہ علیہم الرضوان میں سے نامور شخصیتیں ان کی اس خوبی کی معترف تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے عظیم و جلیل صحابی اور خلیفہ راشد و عادل بڑے مشکل اور اہم ترین مسائل میں ان سے رجوع فرماتے۔ وہ یقیناً اس بات کے مستحق ہیں کہ مسئلہ ان سے پوچھا جائے۔

(باقی ۲۶ پر)

ہفت روزہ
خدام الدین
لاہور

جلد ۲۶ ، شمارہ ۳۱
۲۳ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ ، ۳۰ جنوری ۱۹۸۱ء

اس شمارے میں

رئیس الادارہ
پیر طریقت حضرت مولانا عبید اللہ انور مدظلہ
مدیر منتظم
مولوی محمد اجمل قادری
مدیر
محمد سعید الرحمٰن علوی

بدل اشتراک	سالانہ -/۶۰ ، ششماہی -/۳۰
	سہ ماہی -/۱۵ ، فی پرچہ ۱/۵۰

قومی زبان کا مسئلہ

خدام الدین کی سابقہ اشاعت میں قومی زبان کی ترویج کی غرض سے قائم کردہ ادارہ مقتدرہ کے شعبہ علوم عمرانی کے ناظم ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری کا مقالہ قارئین کی نظر سے گذرا ہوگا جس میں موصوف نے قومی زبان کے سلسلہ میں ایک جائزہ پیش کیا ہے جو کم و بیش دو ہزار افراد سے رابطہ کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کو دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اصل مسئلہ ملک میں ہر سطح پر قومی زبان کی ترویج کا ہے جو ابھی تک ہمارا منہ تک رہی ہے۔

پاکستان کے قیام کو ایک لمبا عرصہ گذر گیا ہے لیکن کہنا یہ چاہیئے کہ آئین و قانون، روایات و اقدار اور ہر اعتبار سے گویا ابھی روزِ اوّل والا معاملہ ہے۔ ملک کی قومی زبان سے متعلق بانی پاکستان سے لے کر اب تک کی ہر ذمہ دار شخصیت نے واضح طور پر کہا کہ وہ اردو ہوگی۔ اس سلسلہ میں قانونی تحفظات کا انتظام کیا گیا، ادارے بنائے گئے بہت کچھ ہوا اور ہو رہا ہے لیکن بدقسمتی سے عمل کا خانہ خالی ہے۔ پچھلے دنوں ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہمیں بعض ایسے دوستوں نے بتلایا جو زکوٰۃ کمیٹیوں کے ممبر یا چیئرمین ہیں کہ ہمارے پاس اس ضمن میں جو ڈاک وغیرہ آتی ہے اس کا بیشتر حصہ انگریزی زبان میں ہوتا ہے ان میں سے اکثر حضرات ایسے تھے جو اردو کے ساتھ ساتھ عربی تک سے بخوبی واقف تھے لیکن وہ انگریزی سے نابلد تھے اس لئے وہ اس معاملہ میں پریشان تھے کہ کیا کیا جاتے —— ہمیں یاد پڑتا ہے کہ بعض احباب نے اس سلسلہ میں متعلقہ محکموں کو لکھا بھی ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟

بہرحال یہ ایک محکمہ کا رونا نہیں سارا ملک اس قسم کے چرکوں کا شکار ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ ہم کب اس معاملہ میں اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں گے؟

آج ہمارے بعض دوست علماء پر یہ الزام لگانے میں کمال دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کہ ان لوگوں نے تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انگریزی زبان سیکھنے کی مخالفت کی تھی۔ حالانکہ واقعات کی دنیا میں یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ برصغیر کی آزادی کے سلسلہ میں تحریکی قافلہ کے روح رواں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے لے کر حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، فقیہ عصر مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہم اللہ تعالیٰ تک علماء دین کی تصریحات موجود ہیں کہ کسی بھی زبان کا بحیثیت زبان حصول نہ حرام ہے نہ مکروہ، لیکن کسی زبان کی آڑ میں اُس زبان بولنے والی قوم کی تہذیب کا تسلّط بلاشبہ غلط تھا اور غلط ہے اور اسی بات کا اُن حضرات نے مختلف انداز میں اظہار کیا —— آج ہمارے بعض بڑے کسی نہ کسی درجہ میں اس بات کو سمجھنے لگے ہیں لیکن اس معاملہ پر جس احساس ذمہ داری کی ضرورت ہے وہ ابھی تک ناپید ہے۔

انگریز نے اپنے دورِ استبداد میں یہاں کی آبادی کے قلب و ذہن کو بدلنے کی غرض سے جو ابتدائی اقدامات کئے اور جن مسائل کو بنیادی اہمیت دی ان میں زبان کی تبدیلی کا مسئلہ بھی تھا —— اور یہ ایسی بات ہے جس کا کوئی پڑھا لکھا باشعور آدمی انکار نہیں کر سکتا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ حصول آزادی کے بعد "ذہنی انگریزیہ" بننے کا شوق ختم نہیں ہوا۔ اور جن لوگوں کو بخت و اتفاق نے بڑا مقام دے دیا تھا انہوں نے بھی زیادہ سے زیادہ اعلانات کی حد تک اردو کی بات کہی لیکن اپنی عملی زندگی میں انہوں نے ہمیشہ اس سے اعراض برتا —— تاہم یہ مقام مسرت ہے کہ موجودہ سربراہ مملکت اس سلسلہ میں واضح احساسات رکھتے اور عملاً کوشاں ہیں۔ مثلاً ابھی حال ہی میں انہوں نے ترکی کے دورہ کے دوران صدر ترکی کی ترکی زبان میں کی گئی تقریر کے جواب میں اردو میں تقریر کی۔ جو بلاشبہ ایک مستحسن اقدام ہے —— اے کاش! کہ ہمارے اعلیٰ انتظامی عہدیدار اور وزراء وغیرہ سربراہ مملکت کے عمل کو ہی نمونہ بنا سکیں۔

آج اس جائزہ رپورٹ کے پیشِ نظر سب سے بڑا الزام "انتظامیہ" پر آ رہا ہے کہ ان کا "ذوقِ بادشاہی" اس معاملہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس ناروا رکاوٹ کو دور کرنے میں حکومت کو کیا مشکل درپیش ہے؟ حکومت کو جرأت سے کام لے کر اس ذہنیت کو بدلنا چاہیے۔ اردو کی تہی دامنی یا اس نوع کی جتنی فرضی مجبوریاں کل تک پیش کی جاتی تھیں وہ آج سب قریب قریب ختم ہو چکی ہیں اور اب کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ آئیں —— کمال خلوص کے ساتھ اپنی رواج دیں —— ہم حکومت سے انتظامیہ کے ممبروں، عدلیہ کے ارکان سمیت تاجر و صنعت کار، مزدور و کسان ہر کسی سے یہی عرض کریں گے کہ اردو بولیں، اردو لکھو، اردو پڑھو اس سے ہمارا ملّی اور قومی تشخّص اجاگر ہو گا اور ہم دنیا میں باوقار قوم کے طور پر پنپ سکیں گے۔

علوی

ایک بے مثال کارنامہ

ہمارے محترم کرمفرما جناب ڈاکٹر لال دین صاحب اخگر نے حضرت امام الاولیاء مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ کی زندگی اور ان کی علمی و دینی خدمات" پر پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا ہے جس کے نتیجہ سے موصوف کو ۱۲ جنوری ۱۹۸۱ء کو آگاہ کیا گیا۔

ڈاکٹر اخگر صاحب حضرت شیخ التفسیرؒ سے عزیزداری کا تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ علم و فضل بزرگ ہیں مدتوں انہوں نے تدریسی میدان میں خدمات سرانجام دیں۔ ہزاروں صفحات لکھے ان میں کتابیں بھی ہیں اور مقالات بھی کتابوں میں حضرتؒ ہی کی سوانح

(باقی ۶ پر)

مجلسِ ذکر

ضبط و ترتیب : علوی

اُمّت کو اپنا مقصد نہیں بھولنا چاہیئے

پیر طریقت حضرت مولانا عبید اللہ انور دامت برکاتہم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم : اما بعد :۔

محترم حضرات و خواتین! اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں امت محمدیہ کو "خیر امّۃ" کے لقب سے سرفراز فرمایا ہے اور اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ اس کا کام اور مقصد دوسروں کی بھلائی اور فائدہ ہے۔

جہاں تک دوسروں کے فائدے اور بھلے کا تعلق ہے ایک آدمی دوسرے کو متعدد وجوہ سے فائدہ پہنچا سکتا ہے لیکن یہاں جو بات ہے وہ اور ہی ہے یعنی دوسرے کو وہ فائدہ پہنچانا جس سے اس کے دین کا بھلا ہو۔ اس کی عاقبت سنورے اور وہ آنے والی دنیا میں سرخرو ہو سکے۔ دنیوی اور مادی اعتبار سے کسی کو فائدہ پہنچانا بھی بہرحال فائدے سے خالی نہیں اس کے بھی اچھے اور بہتر ثمرات پیدا ہوتے ہیں لیکن بہرحال یہ وقتی بات ہے۔ اس کے فوائد دنوں ہفتوں مہینوں یا زیادہ سے زیادہ چند سالوں پر پھیلے ہوں گے لیکن جس فائدے اور بھلائی کی اللہ تعالیٰ نے بات کہی اور جسے امّت کا قومی اور ملّی شعار قرار دیا وہ فائدہ لامحدود ہے اس زندگی میں بھی اس کے بہتر ثمرات سامنے آتے ہیں تو آنے والی زندگی جو لامحدود ہے اور جس کا ایک ایک دن پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ اس پر بھی اس کے فوائد مرتب ہوں گے۔

حضور علیہ السلام کے صحابہ علیہم الرضوان نے اپنے آقا و مولیٰ سے یہ بات سیکھی اور گرہ میں باندھ لی انہوں نے پھر اس کی خاطر اپنی زندگیاں تج دیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کی غذا بن گئی انہوں نے کسی بھی موقعہ پر اس معاملہ میں نرمی اور رعایت نہیں برتی بلکہ جو منشار ربانی تھا اسے ٹھیک ٹھیک پورا کیا۔ وہ اس مقصد کی خاطر گھروں سے بے گھر ہوئے، شہر شہر پھرے اور دُور تک انہوں نے اس پیغام حق کو پھیلایا۔ ہندوستان اور چین تک وہ حضرات پہنچے۔ مختلف مقامات پر ان کی قبریں ان کی عظمت کا پتہ دیتی ہیں —— ان کے بعد آج تک اللہ کے مقبول و محبوب بندے اس کام میں لگے ہوئے ہیں اور اس فرض و مقصد کو نہیں بھولے —— ایسے لوگ ہمارے محسن ہیں ان کی قدر و منزلت اور ان کی عزت و تکریم ہمارا فرض ہے۔ اصل میں تو یہ کام امّت کے ہر فرد کا تھا۔ کہ جو جتنا کر سکتا ہے کرے۔ حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے —— بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً کہ ایک حکم و مسئلہ تمہیں معلوم ہو اسے بھی دوسرے تک پہنچا دو۔

اندازہ فرمائیں کہ اگر امّت کا ہر فرد اس سلسلہ میں متحرک و سرگرم عمل ہو جائے اور اپنی ہمت کے بقدر اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرے تو اللہ کا دین کس طرح پھیل جائے گا —— وہ تو بہرحال پھیل رہا ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں، اللہ تعالےٰ اپنے بندوں سے کام لیتا ہے کسی کو توفیق دے دیتا ہے۔ لیکن اصل کہنا یہ ہے کہ یہ ہماری سب کی ذمہ داری ہے اگر ہم ذمہ داری محسوس نہ کریں گے تو قدرت کسی اور سے کام لے گی۔ دیکھیں

مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسلام قبول کیا اور پھر اس پیغام کو کہاں تک پہنچایا۔ اپنے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے والد بزرگوار مسلمان ہوتے حضرت کو اس کام کے لئے وقف کر دیا۔ اب حضرت کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے اپنی حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ اس مقصد کے لئے خرچ کر دیا۔ ہمارے حضرت دین پوری، حضرت امروٹی رحمہما اللہ تعالیٰ جو حضرتؒ کے شیخ و مربی تھے انہوں نے جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر دیا۔ ہزاروں لوگ ان کی تبلیغ ان کے تزکیہ اور ان کی جد و جہد سے باخدا بنے۔ جب کوئی اللہ کا بندہ محنت اور جد و جہد کرتا ہے تو خالق کائنات اس کی محنت کو منظور قبول فرماتے اور ثمر آور بناتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ راستہ کٹھن ہے، اس میں تکالیف ہیں لیکن بندۂ مومن کا کام تکالیف و مصائب کا مقابلہ کرنا ہے وہ اللہ کے اعتماد کے سہارے آگے بڑھتا ہے تو ساری زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں اور پتھر راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔

تبلیغی جماعت آپ کے سامنے ہے اس کے بانی مرحوم نے محسوس کیا کہ زندگی میں اصل کرنے کا کام کیا ہے تو وہ اس میں لگ گئے۔ آج ان کی محنت کا پھل سامنے آ رہا ہے وہ دنیا میں نہیں ان کے صاحبزادے اور پوتے اسی راہ کی نذر ہو گئے لیکن وہ کام آج چاروں طرف پھیل چکا ہے۔ دنیا کے ظلمت کدوں میں ہزاروں لوگ اسلام کے نور سے منور ہو چکے ہیں اور اب وہ خود اسلام کی بات آگے پہنچانے میں سرگرم عمل ہیں۔

محترم حضرات! اس مجلس کا مقصد بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانا ہے۔ اپنے اللہ کے حضور گذشتہ گناہوں کی تلافی کی درخواست کرنی ہے اور آئندہ کے لئے نئے عزائم اور ولولوں کے ساتھ جد و جہد کا تہیہ کرنا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہاں آنے کے بعد کام پورا ہو گیا، نہیں اس کے بعد بھی آپ کا فرض ہے کہ آپ اس پیغام محبت کے داعی اور مبلغ بنیں۔ گھروں میں اپنی خواتین کو اس رُخ پر لگائیں، اپنے عزیزوں دوستوں حتّٰی کہ واقف و ناواقف سب کے کانوں تک یہ بات پہنچائیں اسی میں کامیابی اور فلاح ہے اور یہی ہمارا مقصد حیات ہے۔"

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اصلاح اور اپنے بندوں کی خدمت کی توفیق دے — و آخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین!

بقیہ: شذرہ

دو جلدیں "مقالاتِ ولایت" اور "انوارِ ولایت" سے ایک دنیا آگاہ ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کے طویل لمحات اس موجودہ مقالہ کے لئے خرچ کئے۔ شبانہ روز محنت کی سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کی اور ایک ایسی دستاویز تیار کر دی جو حضرت لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی زندگی پر ایک مثالی چیز ہو گی۔

پنجاب یونی ورسٹی کے ارباب حل و عقد اس سلسلہ میں شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک عظیم المرتبت علمی، دینی اور سیاسی و ملّی رہنما کی زندگی پر مقالہ کو منظور کیا اور پھر ملک کے بہترین دماغوں کو امتحانی ذمہ داریاں سونپ کر تمام قانونی مراحل طے کر کے آخری نتیجہ کا اعلان کیا۔ ہماری خواہش ہے کہ اہل علم آگے بڑھیں اور اس طرح کی نادرہ روزگار شخصیات پر علمی کام کریں تاکہ نئی نسل حقائق سے آگاہ ہو سکے۔

ہم دل کی گہرائیوں کے ساتھ ڈاکٹر اختر صاحب کے حضور سپاس عقیدت پیش کرتے ہیں اور دعاگو ہیں کہ اگلا مرحلہ یعنی اس عظیم مقالہ کی اشاعت جلد سے جلد ہو سکے۔ ہمیں توقع ہے کہ یونیورسٹی انتظامیہ اس کار خیر میں بھی ہر ممکن تعجیل سے کام لے گی تاکہ تشنگان علوم اس دستاویز سے جلد از جلد استفادہ کر سکیں — امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ یہ مرحلہ جلد سر ہو جائے گا۔ ہم اپنے قارئین سے دعاؤں

خطبہ جمعہ

ضبط و ترتیب: علوی

مخلصین کی ذمّہ داری

جانشین شیخ التفسیر

حضرت مولانا عبیداللہ انور

دامت برکاتہم

بعد از خطبہ مسنونہ:—

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم:— ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ . . . تا . . . وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ (صدق اللہ العظیم) (الجاثیہ ۱۸-۱۹)

ترجمہ: پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک طریقہ پر مقرر کر دیا پس آپ اسی کی پیروی کیجئے۔ اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے۔ جو علم نہیں رکھتے۔ کیونکہ وہ اللہ کے سامنے آپ کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے۔ اور بے شک ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ ہی پرہیزگاروں کا دوست ہے۔"

(حضرت لاہوری قدس سرہٗ)

محترم حضرات! سورۂ جاثیہ کی دو آیات اور ان کا ترجمہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ ان سے متصل ابتدائی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ذکر کیا کہ ان کو ہم نے کس طرح نعمتوں سے نوازا اور انہوں نے ان نعمتوں کی کس طرح ناقدری کی؟ گویا ان کے طرزِ عمل سے بچنے کا سبق ہے ورنہ انعاماتِ ربانی کی ناقدری کے سبب جس طرح وہ راندۂ درگاہ ہوئے دوسرا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ "سنّتِ الٰہی" یکساں ہے — ان سابقہ آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں تاکہ بات زیادہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

"اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور نبوت دی تھی اور ہم نے پاکیزہ چیزوں سے روزی دی اور ہم نے انہیں جہان والوں پر بزرگی دی، اور انہیں دین کے کھلے کھلے احکام بھی دئے پھر انہوں نے اختلاف کیا تو علم آنے کے بعد صرف آپ کی ضد سے! بے شک آپ کا رب قیامت کے دن انہیں فیصلہ کرے گا جس چیز میں وہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے۔"

(حضرت لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ)

بنی اسرائیل کا طرزِ عمل

بنی اسرائیل جن میں اصلاح و ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ کے لاتعداد نبی تشریف لائے انہیں کیا کچھ نہیں ملا۔ لیکن وہ لوگ ضد و عناد کے سبب اختلاف و افتراق کی راہ پر چل نکلے۔ قومی برتری کا بھوت ان پر ایسا سوار ہوا کہ وہ اپنے سوا کسی کو کوئی اہمیت تک نہ دیتے حالانکہ کوئی چیز بھی کسی کی وراثت نہیں ہوتی اہلیت و صلاحیت اصل چیز ہے وہ جس کو نصیب ہو جاتی ہے اس کا بیڑا پار ہو جاتا ہے لیکن بنی اسرائیل کے جاہل اور ہٹ دھرم لوگوں نے خواہی نخواہی اپنا استحقاق ثابت کرنے کی کوشش کی حالانکہ وہ خائب و خاسر ہوئے۔ اور اختلاف کر کے بے راہ ہو گئے۔ نبوّت و قیادت کا تاج محمد عربی صلوات اللہ تعالیٰ علیہ و سلامہ کے سر پر رکھ دیا گیا جب مکہ معظمہ سے لے کر مدینہ طیبہ تک آخری نبوّت کا پیغام

سرحدی پہنچا اور پھیل گیا بلکہ اطراف و اکناف کے علاقوں پر رحمت باری برسنے لگی تو مخالفین نے عجیب و غریب ہتھکنڈے شروع کر دئے۔ ان ہتھکنڈوں کی اصل و اساس ان کی ہوا و ہوس تھی لیکن اللہ تعالےٰ نے اپنے آخری رسولِ برحق کو واضح طور پر بتا دیا کہ آپؐ کا کام اس شریعتِ غرا کی پیروی ہے جو ہم نے آپؐ کے لئے تجویز کی۔ یہ بندگانِ ہوس لاکھ سر ماریں آپؐ نے ان کا کہنا نہیں ماننا ـــــ ان آیات کے متعلق دیکھیں کہ خدام قرآن کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

خدامِ قرآن کے ارشادات

حضرت لاہوری قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں :-

"آپ اپنی شریعت کا اتباع کریں ان جاہلوں کی خواہشات کا لحاظ نہ کریں"۔ (آیت ۱۸)

"یہ لوگ آپ کو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچا سکیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ فقط متقین کا دوست ہے"۔ (آیت ۱۹)

سحبان الہند مولانا احمد سعید رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

"بنی اسرائیل کی نبوّت کے دور کے بعد آپ کو نبی بنایا اور آپ کو دین کے ایک خاص طریقے اور خاص راستے پر رکھا یعنی شریعت دے کر بھیجا کہ آپ خود اس راستے پر چلیں اور دوسروں کو بھی اس شریعت کی تبلیغ کریں تو آپ اس شریعت پر قائم رہئے۔ اور اسی کی تبلیغ کرتے رہئے اور جاہلوں اور اَن پڑھ لوگوں کا کہنا نہ مانئے جو صحیح علم سے بے بہرہ اور کورے ہیں (۱۸) کیونکہ یہ جہلا اللہ تعالےٰ کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے اور بلاشبہ ظالم اور بے انصاف لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہوا کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالےٰ متقیوں اور پرہیزگاروں کا دوست ہے۔ (۱۹)

(کشف الرحمٰن ص ۹۶-۹۷)

حضرت شیخ الاسلام پاکستان مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ نے لکھا :-

"یعنی ان اختلافات اور فرقہ وارانہ کش مکش (جس کا باعث یہود تھے اور آج ـــــ؟) کی موجودگی میں ہم نے آپ کو دین کے صحیح راستہ پر قائم کر دیا تو آپ کو اور آپ کی امت کو چاہیئے کہ اس راستے پر برابر مستقیم رہے کبھی بھول کر بھی جاہلوں اور نادانوں کی خواہشات پر نہ چلے ـــــ مثلاً ان کی خواہش یہ ہے کہ آپ ان کے طعن و تشنیع اور ظلم و تعدی سے تنگ آکر دعوت و تبلیغ ترک کر دیں یا مسلمانوں میں بھی ویسا ہی اختلاف و تفریق پڑ جائے جس میں وہ لوگ خود مبتلا ہیں ـــــ اندریں صورت واجب (لازم) ہے کہ ان کی خواہشات کو بالکل پامال کر دیا جائے"۔ (عثمانی ص ۶۴۳)

صاحب درس قرآن خواجہ عبدالحی مرحوم و مغفور ذرا مزید وضاحت سے بات کرتے ہیں :-

"جب بنی اسرائیل نے دنیا میں باہمی فرقہ بندی اور خواہشوں کی پیروی کا دروازہ کھول دیا اور اپنی بادشاہت سے ظلم و ستم کے سوا اور کوئی کام نہ لیا تو ہم نے اے ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسان کو دین کا راستہ سمجھانے کے لئے تمہیں بھیجا اور بری باتوں کو پوری طرح کھول کر بتا دیا اور بنی اسرائیل وغیرہ کی شرارتیں بھی بتا دیں جن میں پھنس کر انہوں نے دین کو اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کا ذریعہ بنا دیا تھا تا کہ تم ان سے بچو ـــــ اب تمہیں اور تمہارے ماننے والوں کو ہماری ہدایتوں کے مطابق چلنا چاہیئے اور نادانوں کی باتوں کو بالکل نہ سننا چاہیئے کیونکہ ان کی باتیں بیکار ہیں ان پر چل کر

تم اصل کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ پھر اللہ بھی ان نادانوں کی باتوں سے راضی نہیں۔ ان لوگوں نے ظلم و ستم پر کمر باندھ لی ہے اور باہم ایک دوسرے کی مدد کے لئے تیار ہوگئے ہیں تاکہ اپنا جتھا بنا کر صحیح راستے سے پورے زور کے ساتھ لوگوں کو روکیں، اللہ ان کا حمایتی یا ساتھی نہیں، یہ لوگ اللہ کا حکم نہیں مانتے۔ بلکہ اس کے خلاف چلتے ہیں۔ اللہ تو ان کا ساتھی مددگار اور حمایتی ہے جو اس کے غضب سے ڈر کر گناہوں سے بچتے ہیں اور ہر کام کرنے سے پہلے خوب سوچ لیتے اور جاننے والو سے پوچھ لیتے ہیں کہ یہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے طریقے کے خلاف تو نہیں۔ اللہ نے جن باتوں سے منع کیا ہے وہ بالکل صاف ہیں ان کے پیچھے پڑنا اللہ کی نافرمانی کرنا ہے"۔

(درس قرآن ج ۶ ص ۲۶۴)

نتائج

محترم حضرات! ہم نے ایک چھوڑ چار خدام قرآن کے وہ ارشادات نقل کر دئے جو انہوں نے ان آیات کے ضمن میں لکھے تھے۔ پہلی بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ بنی اسرائیل کے ظلم و زیادتی، اصل راہ کو چھوڑ کر افتراق و انتشار کی راہ اپنانے کا نتیجہ تھا کہ وہ خالقِ کائنات کی نعمتوں سے محروم ہوئے اور پھر محمدؐ عربی (صلی اللہ علیہ و اصحابہ وسلم) کی نبوت کا دنیا میں ڈنکا بجا۔

دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ حضور ختمی مرتبت علیہ السلام پر واضح کر دیا گیا کہ نجات و سلامتی کی راہ اس دین و شریعت اور منہاج و طریقہ پر چلنے میں ہے جو اللہ تعالےٰ نے خود تجویز فرمایا۔ اور جاہل و ہٹ دھرم قسم کے بے شعور عوام کی مرضی و خواہش کی اتباع دنیوی اور اخروی نقصان کا باعث ہے۔

تیسری بات یہ کہ وہ بے راہرو لوگ جو بندگانِ ہوس ہیں وہ اللہ تعالےٰ کی گرفت کے مقابلہ میں کسی کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ وہ تو اپنی بے راہروی کی سخت ترین سزا کا خود شکار ہوں گے دوسروں کے کیا کام آئیں گے۔

چوتھی بات یہ کہ ظالم و ناہنجار لوگ ایک دوسرے کی مدد و تعاون پر ہر وقت کمربستہ رہتے ہیں گویا "الکفرُ ملّۃ واحدہ" کے مصداق کفر کی مختلف صورتیں اہل اسلام کے مقابلہ کے لئے اکٹھی ہو جاتی ہیں ـــــ لیکن گھبرانے کی بات نہیں کیونکہ جس نے اللہ پر بھروسہ کیا، اس کے دین پر چلا اور تقویٰ و پرہیزگاری کی زندگی اختیار کی اس کا ساتھی اور حمایتی خود اللہ ہے۔

آخری بات

آخری اور مختصر بات یہ ہے کہ ہمیں سوچنا ہے کہ کیا ہم اللہ تعالےٰ کی شریعت کی پیروی کر رہے ہیں یا ہوا و ہوس کے بندے بن چکے ہیں؟ ہمیں دیکھنا ہے کہ "منزل من اللہ" قانون سے اختلاف کا وطیرہ تو ہم نے اختیار نہیں کر لیا؟

اور ہمیں اپنی خدا خوفی اور تقوےٰ کی کیفیت کو دیکھنا ہے ـــــ اگر جوابات قرآن و سنّت کی روشنی میں درست ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے لیکن اگر شریعت کے بجائے خواہشات کا سلسلہ ہے اور قانون الٰہی سے انحراف ہے اور تقویٰ سے محرومی ہے تو یہ بڑی ہی عبرت ناک بات ہے جس کے ازالہ کی فکر ازبس لازمی ہے کیونکہ زندگی بڑی بے ثبات ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اسی حال میں موت آجائے اور پھر سدا کا رونا مقدر بن جائے۔

اسی دعوتِ فکر پر اختتام کرتے ہوئے حضرت حق کی بارگاہِ قدس میں دعا گو ہوں کہ ربّ العزت ہمیں اپنی مرضیات کا پابند بنائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

لال دین اختر ایم اے، پی ایچ ڈی
شیخوپورہ

قسط ۳

ابلیس - بستر مرگ پر

اگرچہ میں طوفانِ نوح میں فنا ہونے والے اپنے ساتھیوں اور غرقِ نیل ہونے والے اپنے مریدینِ خاص کی ہلاکت کا بدلہ کئی دفعہ لے چکا ہوں۔ لیکن بلوائیوں سے عثمان بن عفان کا عین مدینۃ الرسول میں قتل اور میدان کربلا میں خاندانِ سعادت کی تباہی میری زندگی کے قیامت تک شاہکار سمجھے جائیں گے۔

میرے فتوحات روزِ ازل سے اب تک شمار نہیں کئے جا سکتے۔ اقوام عالم میں رات دن خوں ریزی، دغابازی اور سپر طاقتوں کو جوع الارضی کے مرض میں مبتلا کرنا میرا مشغلہ ہے۔ روس، امریکہ، چین یورپ کا سارا برّاعظم غرضیکہ قطب شمال سے قطب جنوبی تک میری ماجدھانی کے حدود ہیں۔

حاضرین

(تحسین و آفرین کے نعرے) مبارک، مبارک، مرحبا، مرحبا۔ زندہ باد۔ تاج و تخت خصومتِ آدم زندہ باد

مگر آج میری روح پر ایک شدید خطرہ مسلط ہو رہا ہے۔ میرے دل میں سخت اضطراب ہے۔ کیونکہ میرے ماضی کے کارناموں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے اور میرے مستقبل کو تاریک کرنے کے لیے ایک بہت بڑا طوفان تیار کیا گیا ہے جب میں خلوت میں اس کے نتائج پر غور کرتا ہوں تو میری جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ میرا جسم کانپنے لگتا ہے۔ مجھ کو اپنی مفتوحہ سرزمین کے قریوں اور شہروں کے در و دیوار کاٹنے کو بھاگتے ہیں انہی لیل و نہار میں میرے خدشات مجھ پر یوں اثر انداز ہوتے ہیں کہ مجھ کو اپنی موت سامنے نظر آنے لگی ہے۔ ماضی کے کارہائے نمایاں میری حوصلہ افزائی کرنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں میرے قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس تازہ عالمگیر سازش کا مقابلہ میری ہمت سے باہر ہے۔ میں نے اس یاس و ناامیدی کی گھڑیوں میں یہی بہتر خیال ہے کہ تم سب کو بلا کر اس بلائے ناگہانی کی خبر دوں اور تم کو چند ضروری وصیتیں کر سکوں۔ کیونکہ ایسے زہرہ گداز حالات میں میرا زندہ رہنا بالکل محال نظر آتا ہے۔ اب اگر تم میرے مرنے کے بعد بھی اس سیلِ ہلاکت خیز کی روک تھام کر سکو تو میری رُوح کو ہمیشہ سکون و اطمینان رہے گا۔ کیا میں جلد از جلد میں اپنے دل کے تمام خطرات تمہارے سامنے بیان نہ کر دوں۔

"حاضرین چاروں طرف سے"

"حضورِ والا۔ بیان کیجئے۔ ضرور بیان کیجئے۔ ہم آپ کے ارشادات پر ہر طرح کی قربانیاں پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

لعین۔ ہائے۔ وامعیبتا! واحسرتا! میرے حواس پر مجھ کو قابو نہیں ہے۔ میرا دماغ مختل ہو رہا ہے۔ میرے دل کی گھبراہٹ مجھ کو موت کے مہیب قعر میں گھسیٹ کر لے جا رہی ہے۔

"یہ بات کہہ کر تخت پر گر جاتا ہے۔ حاضرین پر سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے مقربین اس کے منہ میں رُوح افزا مشروبات ٹپکاتے ہیں اس کے زرد چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیتے ہیں۔ کوئی پاؤں دباتا ہے کوئی پنکھا ہلاتا ہے۔ آہ و بکا کی کیفیت چاروں طرف عام ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب مردود خلائق جانبر نہیں ہوگا۔ مگر پندرہ منٹ کی غشی کے بعد اس کے اعضا میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ حاضرین میں اب تک مکمل خاموشی ہے۔ سب کی نگاہیں ابلیس کے تخت کی طرف لگی ہوئی ہیں اتنے میں ہائے ہائے کی آواز بلند ہوتی ہے اور ساتھ ہی لعین ازلی بیٹھ کر پانی مانگتا ہے۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مقربین مشروبات پیش کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی حالت میں قدرے تبدیلی آتی ہے اور اب دوبارہ حاضرین کو مخاطب

کرکے اپنی تقریر کا آخری حصہ پیش کرتا ہے"

میرے جانبازو! میرے جیالو! شاید میری زندگی کے چند سانس باقی ہیں لہٰذا میں نہایت اختصار سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں۔ میں تقریباً بتیس سال سے پاکستان میں اسلام زندہ باد۔ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کی آواز سنتا ہوں لیکن میں تم سب کو ہزار مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں۔ کیونکہ تم نے ہمیشہ ہی ایسی منحوس آوازوں کو اپنی ریشہ دوانیوں سے بے اثر کرکے رکھ دیا اور آج تک ملّا ازم کا حکومتِ الٰہیہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ مگر صدر ضیاء الحق کا تازہ اعلان کہ پاکستان میں مکمل اسلامی حکومت قائم کی جائے گی" اور پھر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس کا ببانگ دہل اسلامی اقتدار، اسلامی معاملات اور اسلامی احکام کو از سرِ نو اولاد آدم پر جبراً مسلط کرنے کی یقین دہانی کرانا اور اس کے لیے نہایت ٹھوس اقدامات کرنا میرے حق میں سراسر ہلاکتِ ابدی کا پیغام ہے۔ اس اعلان سے میری سلطنت کے تمام ایوانوں میں غیر یقینی کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ مجھ کو ڈر ہے روس، امریکہ اور یورپ کی تمام حکومتیں قرآن جیسی کتاب اور نظامِ شریعت کی بالادستی کو تسلیم نہ کر لیں۔ الاماں! الاماں! آج صدر ضیاء الحق کی اسلام نواز تقریر کی تعریف و تحسین چار دانگ عالم میں عام ہے۔ تمام اخباروں کے ایڈیٹوریل کے صفحات اور پھر اپنوں اور غیروں کی زبان پر رات دن ضیاء الحق زندہ باد، اسلام زندہ باد کے کلمات جاری و ساری ہیں۔

میرے مجاہدو! میں دُعا کرتا ہوں۔ تم آمین کہو۔ ضیاء الحق اور ملّا ازم کی کامیابی سے پہلے پہلے مجھ کو موت آ جائے ہائے! میرا صدیوں کا وقار ختم ہوتا نظر آتا ہے۔

حاضرین! ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں، نصیبِ دشمناں

"لعین ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے۔ اور حاضرین متوجہ ہو جاتے ہیں"

میرے عزیز ساتھیو! کیا میرے خدشات کا کوئی فوری مداوا ہو سکتا ہے؟ کیا میں اپنے عقیدت کیش مرد و زن سے یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ وہ اس آئی ہوئی آفت کی روک تھام کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے اور اپنی سر زمین کے چپے چپے پر ہزاروں قربانیاں پیش کرکے اپنی قدیمی روایت اور میرے ازلی دعاوی کی لاج رکھیں گے۔

حاضرین!

"ہزاروں دفعہ، محسن قدیم" خاموشی کا اشارہ — میں تمہاری عقیدت اور تمہاری ہمتوں کو بارہا آزما چکا ہوں لہٰذا آج میری آخری وصیت پر عمل پیرا ہو کر دائمی سرخروئی حاصل کرنے کا وقت ہے مجھے اُمید کامل ہے کہ اولاد آدم کو فریب دینے میں تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

(باقی آئندہ)

محمد شفیع عمر الدین (میر پور خاص سندھ)

دُوسروں کے ساتھ تعاون اور عدمِ تعاون کا دستور العمل

مسلمانوں کو صرف اتفاق اور آپس میں تعاون کر کے تقویت دین کے مقصد کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے ـــــــ سید جمال الدین افغانیؒ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ (المائدہ آیت ۲)

ترجمہ: اور آپس میں نیک کام اور پرہیز گاری پر مدد کرو اور گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو۔

یعنی نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی یعنی ظلم و ستم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو بلکہ اس کے برعکس نیکی اور پرہیز گاری کی ترغیب دو ..... اس آیت میں دوستی اور تعاون کا دستور العمل ہے کہ دوستی میں کسی کی "بیجا حمایت" نہ کرو۔ جیسے کہ آج کل پارٹیوں میں ہوتا ہے بلکہ بِرّ (نیکی) تقویٰ (پرہیز گاری) میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے رہو۔ لہٰذا تم کو چاہیئے کہ نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو تاکہ تم کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضوان سے حصّہ ملے۔ اور سخت عذاب سے محفوظ رہو" بِرّ یعنی نیکی سے لوگ خوش ہوتے ہیں اور "تقویٰ" سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے۔ جس نے ان دونوں صفتوں کو اپنے اندر جمع کر لیا، اس نے سعادت مکمل کر لی۔ "بِر" فعلِ خیرات (نیکی تو نیک کام کرنے کا نام ہے اور "تقویٰ اور پرہیز گاری" ترکِ منکرات (بُرے کاموں سے رکنے) کا نام ہے جس میں یہ دونوں صفتیں جمع ہو جائیں اس کی خوش نصیبی کا کیا پوچھنا۔

(معارف القرآن حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ)

بِرّ یعنی نیک کام کریں

بندے کو چاہیئے کہ نیک کام خود بھی کرے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دے۔ اور نیک کام کرنے میں دوسروں کی مدد کرے "بِرّ" ایک جامع لفظ ہے جس میں سب نیک کام اور بھلائیاں جو شریعتِ مطہرہ میں مذکور ہیں آجاتی ہیں۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یہی نیکی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو بلکہ نیکی تو یہ ہے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر۔ اور اس کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں مال دے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے اور جو اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہیں جب وہ عہد کریں اور تنگ دستی اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیز گار ہیں (البقرہ آیت ۱۷۷)

(ف) ..... اس آیت میں پہلا فرض ایمان ہے، دوسرا انفاقِ مال تیسرا اقامۃ صلوٰۃ و ایتاءِ زکوٰۃ، چوتھا ایفائے عہد اور پانچواں تکالیف میں صبر (اولٰئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا) ان فرائض کو بجا لانے والے ہی سچے ہیں اور یہی "امام" بننے کے قابل ہیں۔ (شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ)

حاصل کلام: "بِر" (نیکی) کا پہلا زینہ ایمان کا لانا ہے اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے عقائد کو شریعت مطہرہ کے مطابق صحیح رکھیں کوئی نیکی تب تک قابل قبول نہیں ہو سکتی جب تک ایمان اور عقائد صحیح نہ ہوں۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ

فرماتے ہیں کہ شریعت کے دو جُز ہیں:۔ (۱) اعتقادی اور (۲) عملی۔ اعتقاد دین کی اصل ہے اور عمل اس کی شاخ ہے۔ جو شخص (شرعی) اعتقاد کا منکر ہو، وہ نجات پانے والوں میں سے نہیں اور اس کو عذاب اخروی سے چھٹکارا نہیں۔

(از مکتوب ۱۷۔ دفتر سوم)

نیز آپ نے فرمایا:۔

اے سعادتمند! (اوّل) ہم پر اور آپ پر جو چیز لازم ہے وہ اپنے عقاید کو اس طرح کتاب و سنت کے مطابق صحیح کرنا ہے جس طرح علماءِ اہلِ حق نے کتاب و سنت سے ان عقایدکو سمجھا ہے اور ان سے اخذ کیا ہے اللہ تعالیٰ ان حضرات کی کوششوں کو قبول فرمائے (یاد رہے کہ) ہمارا اور آپ کا (کتاب و سنت سے) سمجھنا۔ اگر ان بزرگوں کے فہم کے مطابق نہ ہو تو اعتبار سے گرا ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر "مبتدع و ضال" (بدعتی اور گمراہ) اپنے باطل احکام کو کتاب و سنت سے ہی لیا ہوا سمجھتا ہے اور ان سے اخذ کرتا ہے۔ ان کا یہ حال ہمیں حق سے مستغنی نہیں کر سکتا۔

دوم۔ شرعی احکام کا علم، حلال و حرام اور فرض و واجب کے بارے میں حاصل کرنا چاہیئے۔

سوم: اس علم کے مطابق عمل کرنا چاہیئے

چہارم: تزکیہ و تصفیہ کا جو طریقہ حضرات صوفیاء کرام قدس اللہ تعالیٰ اسرارھم کے ساتھ مخصوص ہے اسے اختیار کرنا چاہیئے۔

جب تک "عقائد" کو صحیح نہ کیا جائے تب تک شریعت کے احکام کا علم فائدہ نہیں دیتا۔ اور جب تک یہ دونوں چیزیں (تصحیحِ عقائد اور شریعت کا علم) پختہ طور پر حاصل نہ ہوں تب تک عمل نفع دینے والا نہیں ہے اور جب تک یہ تینوں چیزیں (عقائد کا صحیح ہونا، شریعت کا علم ہونا، اور اس پر عمل کرنا) میسّر نہ ہوں۔ تب تک تزکیہ و تصفیہ محال ہے۔

(از مکتوب ۱۵۷۔ دفتر اوّل)

تقویٰ اور پرہیز گاری اختیار کریں

دوسری بات جس میں دوسروں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے وہ ہے تقویٰ۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈر کر سب شرعی ممنوعات سے کنارہ کرے اور سب اوامر پر عمل کرے۔ اپنے عقائد، اخلاق، اقوال، افعال و احوال کو شریعت کے مطابق درست رکھے۔ پرہیز گاروں کی ہدایت کا منبع قرآن مجید اور اس کی عملی شرح حدیث شریف ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ (البقرہ آیت ۲)

(قرآن مجید) پرہیز گاروں کے لیے ہدایت ہے

(ف) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت اُبَیّ بن کعبؓ سے تقویٰ کی حقیقت دریافت فرمائی تو انہوں نے جواب دیا کہ اے امیر المؤمنین! کیا آپ کبھی کسی کانٹوں والے راستہ سے گزرے ہیں۔ فرمایا۔ کیوں نہیں۔ حضرت ابی کعبؓ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! پھر آپ نے اس وقت کیا کیا؟ فرمایا کہ میں نے دامن چڑھا کر بچا بچا کر قدم رکھے۔ اور کانٹوں سے بچنے کے لیے اپنی تمام جدوجہد کو خرچ کر ڈالا۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! بس یہی تقویٰ ہے یعنی حق جلّ و علا کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے کے لیے اپنی پوری ہمت اور طاقت کو خرچ کر دینے کا نام تقویٰ ہے۔ اسی لیے ارشاد ہے، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىکُمْ ۚ (الحجرات آیت ۱۳) یقیناً خدا تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہی ہے جو سب سے زیادہ خدا تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہے۔ (معارف القرآن حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ)

حضرت سیدنا امام ربانی مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اٰتٰىکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (الحشر آیت ۷)

ترجمہ: اور جو کچھ تمہیں رسول دے اسے لے لو، اور جس سے منع کرے اس سے باز رہو۔

"پس نجات کا دارو مدار دو چیزوں پر ہے (۱) اوامر پر عمل کرنا اور (۲) نواہی سے اجتناب کرنا اور ان دونوں میں سے آخری جزو معظم ترین ہے جسے تقویٰ اور پرہیز گاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں ایک شخص کی عبادت و ریاضت کا ذکر کیا گیا اور دوسرے شخص کی پرہیز گاری کا ذکر کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: لَا تَعْدِلْ بِالرِّعَةِ شَیْئًا یَعْنِی الْوَرَعَ۔ (یعنی پرہیز گاری کے برابر کوئی چیز نہیں۔)

" نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مِلَاکُ دِیْنِکُمُ الْوَرَعُ۔ یعنی دین کا دارو مدار پرہیز گاری پر ہے۔..... پس تقویٰ اور پرہیز گاری کے جزو کو مدّ نظر رکھنا اسلام کے اعلیٰ ترین مقاصد میں سے ہے اور دین کی اشد ضروریات میں سے ہے اور اس

جزو کا دارومدار "محارم" (حرام کی ہوئی چیزوں) سے بچنے میں ہے .....

"محرمات" سے بچنے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو "حقوق اللہ" کے متعلق ہیں اور دوسری قسم کا تعلق "حقوق العباد" سے ہے۔

(از مکتوب - ۷۶ - دفتر اوّل)

اِثم (گناہوں) سے بچیں

بندے کو کوئی گناہ کا کام نہ خود کرنا چاہیئے اور نہ ہی کسی دوسرے شخص کی گناہ کے کام میں مدد کرنی چاہیئے۔

شریعت میں ایک "اوامر" یعنی کرنے والے کام بتائے گئے ہیں۔ اور دوسرے "نواہی" یعنی نہ کرنے والے کاموں کا ذکر ہے۔ اوامر پر عمل نہ کرنا گناہ ہے اسی طرح نواہی سے نہ رکنا بھی گناہ ہے۔

ہر کلمہ گو کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ خود اوامر و نواہی کا پابند ہو اور دوسروں کو بھی ان کا پابند بنائے۔

ظلم نہ کریں

دین میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنا اور اللہ تعالیٰ نے جو باتیں تم پر اور دوسروں پر فرض کی ہیں ان سے بھی تجاوز کرنا "عدوان" یعنی ظلم ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد کرو۔ خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ مظلوم کی مدد تو کی جا سکتی ہے مگر ظالم کی مدد کیسے کی جائے آپؐ نے فرمایا: اسے ظلم کرنے سے روک دو پس یہی اس کی مدد ہے (ابن کثیر)

اب جو لوگ مظلوم کی مدد کرنے کے بجائے ظالم کے معاون اور مددگار بن جاتے ہیں، انہیں مندرجہ ذیل حدیث شریف کی وعید سے تنبیہ حاصل کرنی چاہیئے اور فوراً اپنے بُرے فعل سے توبہ کرنی چاہیئے۔

حدیث: مَنْ مَشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِيُعِينَهٗ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ (ابن کثیر بحوالہ طبرانی)

ترجمہ: جو شخص ظالم کو جانتے بوجھتے کے باوجود اس کی مدد کے لیے اس کے ساتھ چلا وہ اسلام سے خارج ہوگیا۔

حدیث: ظلم کرنے والے اور ان کے مددگار سب دوزخ میں جائیں گے

(گلزار حدیث از حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ) اللہ ہمیں صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین۔

ملک غلام حیدر ایم اے (گولڈ میڈلسٹ) لیکچرار گورنمنٹ کالج میانوالی

اسلامی تہذیب کے خد و خال

تہذیب کے لغوی معنے کانٹ چھانٹ کرنا اصلاح کرنا، تعلیم دینا، کاشت کاری کرنا، اخلاق و عادات کا سنوارنا اور کلچر وغیرہ کے ہیں لیکن اصطلاح میں تہذیب کا لفظ اصلاح اور درستگی کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے نیت اور ارادے کی درستگی، رسم و رواج، سیاست، معاشرت، معیشت، تجارت، زراعت و صنعت وغیرہ کی درستگی، گویا زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاح کرنا تہذیب ہے۔

بعض مصنفین نے تہذیب کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "وہ ایک ایسا نظام اجتماعی ہے جو انسان کو ثقافتی ثمرات کے حصول میں زیادہ سے زیادہ امداد دیتا رہتا ہے۔"

ایک مفکر "تہذیب" کی وضاحت یوں کرتا ہے

"تہذیب کے معنیٰ شاخ تراشی کرنا ہے آپ نے مالی کو دیکھا ہوگا وہ کیا کرتا ہے؟ وہ پودوں کو پانی دیتا ہے، زمین میں کھاد ڈالتا ہے درختوں کے گلے سڑے اور سوکھے پتوں کو الگ کر دیتا ہے جو شاخیں اِدھر اُدھر پھیل جاتی ہیں انہیں کاٹ ڈالتا ہے ان شاخوں کے کٹنے سے درخت کی نشوونما اچھی ہوتی ہے اسی کو تہذیب کہتے ہیں۔"

تہذیب کے عناصر ترکیبی: دنیا کی ہر تہذیب پانچ عناصر سے بنی ہے اور اسی طرح اسلامی تہذیب کی تکوین بھی انہی سے ہوئی ہے۔ وہ عناصر درج ذیل ہیں۔

۱۔ دنیوی زندگی کا تصور۔
۲۔ زندگی کا نصب العین۔
۳۔ عقائد و افکار۔
۴۔ انفرادی تربیت۔
۵۔ اجتماعی زندگی۔

دنیوی زندگی کا تصوّر

سب سے پہلی چیز جس کا کسی تہذیب میں کھوج لگانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے متعلق اس کا تصوّر کیا ہے؟ وہ اس دنیا میں انسان کی کیا حیثیت قرار دیتی ہے؟ اس کی نگاہ میں دنیا کیا ہے؟ انسان کا اس دنیا سے کیا تعلّق ہے؟ یہ تصوّر کا سوال ایک ایسا اہم سوال ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال پر اس کا نہایت گہرا اثر ہوتا ہے اور اس تصوّر کے بدل جانے سے تہذیب کی نوعیت بنیادی طور پر بدل جاتی ہے۔

انسانی سوچ میں افراط و تفریط

انسان کو ابتداء سے اپنے متعلق بڑی غلط فہمی ہے اور اب تک اس کی یہ غلط فہمی باقی ہے کبھی وہ افراط پر اترتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بلند ہستی سمجھ لیتا ہے اور جبر و قہر اور ظلم و تشدد کا دیوتا بن کر نظر آتا ہے اور کبھی تفریط کی جانب مائل ہوتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے ذلیل ہستی سمجھ لیتا ہے اور درخت، پتھر، دریا، پہاڑ، جانور، ہوا، آگ سورج، چاند غرض ہر اس چیز کے سامنے سر جھکا دیتا ہے جس کے اندر کسی قسم کی طاقت دیکھتا ہے اور ان کو اپنا معبود مان لیتا ہے۔

انسان کی حقیقت

اسلام نے ان دونوں انتہائی تصورات کو باطل کرکے انسان کی اصل حقیقت اس کے سامنے پیش کی ہے وہ کہتا ہے:-

"انسان اپنی حقیقت تو دیکھے کہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟ ایک اُچھلتے ہوئے پانی سے جو پشت اور سینہ کی ہڈیوں سے کھنچ کر آتا ہے۔"

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"انسان کی ابتداء مٹی سے کی۔ پھر مٹی کے نچوڑ سے جو ایک حقیر پانی ہے اس کی نسل چلائی پھر اس کی بناوٹ درست کی اور اس میں اپنی روح پھونکی"

ان آیات میں انسان کے غرور و تکبّر کو توڑا گیا ہے اور اسے اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تو ذرا اپنی حقیقت تو دیکھ کہ ایک نجس اور حقیر پانی کا قطرہ جو رحمِ مادر میں مختلف قسم کی نجاستوں سے پرورش پاکر تیری شکل میں ظاہر ہوا ہے تو تجھے غرور و تکبّر سے کیا واسطہ۔؟

کائنات میں انسان کا درجہ

یہ تو تھی تکبّر شکنی۔ دوسری طرف اسلام انسان کو بتاتا ہے کہ وہ اتنا ذلیل بھی نہیں ہے جتنا اس نے اپنے آپ کو سمجھ رکھا ہے وہ کہتا ہے "ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی"۔

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:۔

"اے انسان کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمہارے لیے مطیع بنا دیا ہے"

انسان نائبِ خُدا ہے

اس سے معلوم ہُوا کہ انسان نہ اتنا عالی مرتبہ ہے جتنا وہ اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور نہ اتنا پست و ذلیل جتنا اس نے خود اپنے آپ کو بنا لیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر اس دنیا میں انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے؟ اس کا جواب اسلام یہ دیتا ہے

"وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض سے اونچے درجے دیئے تاکہ جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اسمیں تمہاری آزمائش کرے۔"

آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت فرشتوں سے باری تعالےٰ نے فرمایا،

"میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں۔"

اس سے معلوم ہُوا کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ کی ہے خلیفہ کہتے ہیں نائب کو۔ نائب کا کام یہ ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اس کی اطاعت کرے اگر ایسا نہیں کرے گا تو باغی سمجھا جائے گا۔

اسلامی تہذیب کا نصب العین

کسی تہذیب کو جانچنے کے لیے اس کے نصب العین کو جاننا ضروری ہے یعنی دنیا میں انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ ساری جدوجہد اور محنت و مشقت آخر کس لیے ہے۔؟

ان سوالات کا جواب یہ ہے۔ کہ اسلام نے انسان کو خدا کا خلیفہ اور روئے زمین پر اس کا نائب قرار دیا ہے۔ جو نصب العین فطری طور پر پیدا ہو سکتا ہے وہ یہ کہ انسان جس کا نائب ہے اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرے۔ اور اس کی نظر میں ایک فرض شناس اور وفادار ملازم قرار پائے یعنی انسانی زندگی کا نصب العین خدا کی رضاجوئی اور اس کی خوشنودی ہے۔

چنانچہ تہذیب اسلامی انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں خدا کے بتائے ہوئے طریقوں کی پیروی کرے اور اپنی آزادیٔ عمل کو شریعت کی قیود سے مقیّد کردے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد یہی بتایا گیا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

"اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ جس نے تمہیں پیدا کیا۔"

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے:۔

"میں نے جنّوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔"

یہ وہ نصب العین ہے جو اسلامی تصوّر حیات نے بتلایا ہے اور کسی ادنیٰ فرق کے بغیر ٹھیک نصب العین یہی ہے۔ قرآن مجید کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی اسی مقصد کی خاطر صرف کر دینی چاہیئے چنانچہ ایک جگہ فرمان ربّانی ہے۔

"اے پیغمبر کہہ دے میری نماز اور میری عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو تمام جہان کا رب ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اس کے آگے سر جھکانے والا ہوں۔"

قرآن پاک کی ایک اور آیت اس چیز کو یوں واضح کرتی ہے۔

"اللہ نے مومنوں سے انکی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں جن کے معاوضے میں صرف انہی کے لیے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔"

سورہ فتح میں مسلمانوں کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دوستی اور دشمنی جن کا رکوع و سجود سب کچھ اللہ کی خوشنودی کے لیے ہے۔ چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے۔

"محمد اللہ (کے بھیجے ہوئے) رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں تم ان کو رکوع اور سجود کرتے ہوئے دیکھو گے یہ لوگ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب گار ہیں۔"

ان تمام چیزوں کو حضور اکرمؐ نے ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے کہ:

"اللہ صرف وہی عمل قبول کرتا ہے جو خالصتًا اس کے لیے کیا جائے۔ اور جس سے محض اس کی رضا جوئی مقصود ہو۔"

اس سے معلوم ہُوا کہ اسلام نے ہر قسم کی دنیوی اور اخروی اغراض کو چھوڑ کر ایک چیز کو زندگی کا نصب العین اور انسان کی تمام کوششوں کا مقصود اور تمام ارادوں اور نیتوں کی غایت قرار دیا ہے اور وہ چیز اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کا حصول ہے

عقائد و افکار

اسلام ایک حکیمانہ مذہب ہے۔ وہ تہذیب کی عمارت بودی بنیادوں پر تعمیر نہیں کر سکتا۔ وہ سب سے پہلے انسان کی روح اور اس کے قوائے فکری کی گہرائیوں میں مضبوط بنیادیں قائم کرتا ہے پھر ان پر ایک ایسی عمارت بناتا ہے جو کسی کے ہلائے ہل نہیں سکتی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اسلام نے پانچ بنیادی عقائد پیش کئے ہیں۔

۱۔ ایمان باللہ ۲۔ ایمان بالملٰئکۃ۔ ۳۔ ایمان بالرسل۔ ۴۔ ایمان بالیوم الآخر ۵۔ ایمان بالکتب،

ایمان باللہ

اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے باقی جتنے اعتقادات و ایمانیات ہیں، وہ سب اسی ایک اصل کی فرع ہیں اور جتنے اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ ملائکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے فرشتے ہیں۔ کتابوں پر اس لیے ایمان ہے کہ وہ خدا کی نازل کی ہُوئی ہیں۔ رسولوں پر اس لیے ایمان ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہُوئے ہیں۔ قیامت پر اس لیے ایمان ہے کہ وہ خدا کے انصاف کا دن ہے۔ غرض تمام عقائد کی بنیاد اللہ پر ایمان لانے پر قائم ہے۔

ایمان باللہ کی مجمل صورت جس کے اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کو دخولِ اسلام کی پہلی اور لازمی شرط قرار دیا گیا ہے کلمہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه ہے یعنی دل سے اس امر کی تصدیق اور زبان سے اس امر کا اعتراف کہ "اِلٰـه" بجز اس ایک ہستی کے اور کوئی نہیں ہے قرآنِ حکیم میں ایمان باللہ یعنی اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالےٰ ہے:

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ

مومنو! اللہ پر ایمان لاؤ۔

۲۔ ایمان بالملٰئکۃ

فرشتوں پر ایمان دراصل ایمان باللہ کا تتمہ ہے۔ ملائکہ کا ایک اجمالی تصوّر تمام قوموں میں رہا ہے کسی کے خیال میں وہ عقول ہیں، کسی کے نزدیک وہ خدا کے تصورات ہیں کسی نے انہیں خدا کی اولاد کہا ہے۔ فی الجملہ ارباب مذاہب میں فرشتوں کے متعلق یہ اعتقادِ عام رہا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح خدا کی خدائی میں شریک ہیں اسی لیے ان کی عبادت بھی کی گئی ہے۔ مگر اسلام نے فرشتوں کا ایک ایسا تصوّر دیا ہے جس سے شرک کے تمام راستے بند ہوگئے۔ قرآن نے بتلایا کہ فرشتے خدا کی اولاد نہیں نہ اس کے شریک کار ہیں بلکہ محض اس کے بندے اور غلام ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"کافروں نے کہا کہ اللہ اولاد رکھتا ہے۔ پاک ہے خدا (فرشتے) تو اس کے معزّز بندے ہیں۔ اس کے آگے بڑھ کر بات تک نہیں کر سکتے اور بس وہی کرتے ہیں جس کا حکم دیتا ہے"

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:۔

"بجلی حمد و ثناء کے ساتھ اس کی پاکیزگی بیان کرتی ہے اور فرشتے خوف کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔"

ایک اور جگہ ان کی اطاعت کو یوں نقل کیا گیا ہے:۔

"وہ کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے جو خدا نے ان کو دیا ہے اور وہی کرتے ہیں جسکا انہیں حکم دیا جاتا ہے"

اس تصور نے شرک کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی۔ کیونکہ انسانوں کی طرح وہ بھی عاجز بندے ثابت ہو گئے۔ ان کا کام وحی لانا، ارواح قبض کرنا، اعمال لکھنا، جہاد میں مسلمانوں کی نصرت و امداد کرنا، خدا تعالےٰ کی عبادت کرنا اور اس کے حکم کو بجا لانا ہے۔

۲۔ ایمان بالرسل

توحید کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ رسالت ہے جس طرح اعتقاد کی جہت میں توحید اصل دین ہے اسی طرح اتباع کی جہت میں رسالت اصل دین ہے۔ رسالت کے اعتقاد کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف عقائد اور عبادات میں بلکہ زندگی کے تمام علمی مسائل میں اس طریقہ کی پیروی کی جائے جس پر خدا کے رسول چلے ہیں کیونکہ خدا نے جس علم اور نورِ بصیرت سے ان کو بہرہ ور فرمایا تھا اس سے غلط اور صحیح طریقوں کا فرق یقینی طور پر انہیں معلوم ہو جاتا تھا اس لیے وہ جو کچھ ترک یا اختیار کرتے تھے اور جو کچھ حکم دیتے تھے وہ سب خدا کی طرف سے تھا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام دوسرے لوگوں کا اتباع ترک کرکے صرف انبیاء کے اتباع کا حکم دیا ہے ارشادِ خداوندی ہے۔

"اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ بحکمِ خدا اس کی اطاعت کی جائے۔"

دوسری جگہ قرآن حکیم میں اللہ کے ساتھ رسولوں پر ایمان لانے کا حکم اس طرح دیا گیا ہے۔

"پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ اگر تم ایمان لائے اور پرہیزگاری اختیار کی تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔"

ایمان لانا تو ہر نبی اور رسول پر ضروری ہے البتہ اتباع و اطاعت صرف آخری رسول جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرض ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:۔

"اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔"

دوسری جگہ فرمایا:

"اللہ کی اطاعت کرو۔ اور۔ رسول کی اطاعت کرو۔"

۴۔ ایمان بالکتب

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے اسلام ان تمام کتابوں کو ماننے کا حکم دیتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کے رسولوں پر نازل کی گئی ہیں جس طرح تمام رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسی طرح تمام کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں کہا گیا ہے۔

"اور پرہیزگار وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو تیری طرف اتاری گئی اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے اتاری گئی ہیں۔"

لیکن ایمان کے بعد جہاں سے عملی طور پر اتباع کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں دوسری کتابوں سے تعلق منقطع کرکے صرف قرآن کے ساتھ تعلق رکھنا ضروری ہے۔

اس لیے کہ:۔

۱۔ وہ تغیر و تبدل سے محفوظ نہیں ہیں

۲۔ ان کی تعلیمات میں محدود نسلی قومیت کا اثر نمایاں ہے۔

۳۔ وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی نہیں کر سکتیں۔ جبکہ قرآن مجید ان تینوں خامیوں سے پاک ہے۔

۵۔ ایمان بالیوم الآخر

یوم آخر سے مراد موت کے بعد کی زندگی ہے قرآن مجید کا شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہو جو اس دوسری زندگی کے ذکر سے خالی ہو طرح طرح سے اس کو ذہن نشین کیا گیا ہے اس کی صداقت پر دلائل قائم کئے گئے ہیں۔ اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اس کی اہمیت جتائی گئی ہے اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو شخص اس اُخروی زندگی پر ایمان نہیں لاتا۔ اس کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں

چنانچہ فرمانِ باری تعالےٰ ہے۔

"جن لوگوں نے ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔"

اِنفرادی تربیت

اسلامی تہذیب کا اصل مقصد ایک صحیح اجتماعی نظام قائم کرنا ہے مگر ایسی سوسائٹی کا وجود میں آنا ممکن (باقی صفحہ ۲۷ پر)

واقعات و تاثرات

فخر المحدثین

حضرت مولانا السید فخر الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ

(مولانا برہان الدین سنبھلی) استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

یوں تو اس دنیا میں ہر آنے والا جانے کے لیے ہی آتا ہے اور وقتِ مقررہ پر چل دیتا ہے، مگر یہ روایت بھی قائم ہو گئی ہے کہ آمد کے وقت لبوں پر تبسم، چہروں پر خوشی کے آثار اور رخصت کے وقت چہرے غمگین، آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کے آنے پر خوشیاں منانے والے ہی جانے پر آنسو بہانے والے ہوتے ہیں اور کوئی اس طرح آتا ہے کہ آتے وقت خوشی میں سرمست بہت تھوڑے، مگر جاتے وقت رنج و غم، کرب و الم سے بے حال ایک عالم ہوتا ہے۔ اور جانے والے کی ذات، ایک عارف ربانی کی نصیحت

"آں چناں زی کہ وقت مردن تو
ہمہ گریاں شوند تو خنداں"

کا عملی نمونہ اور آیتِ قرآنی "وجوہ یومئذٍ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ"۔ کا مصداق ہوتی ہے۔

یہ "رتبہ بلند" ہر ایک کو کہاں ملتا ہے ہزاروں۔ بلکہ لاکھوں کروڑوں میں کوئی ایسا ہوتا ہے جس کی موت "عالم کی موت" ہو، جس کا رخصت ہونا ہزاروں دلوں کے صبر و سکون رخصت ہو جانے، جس کا چلا جانا بہت سی مسندوں کے سُونا ہو جانے، جس کا انتقال پوری بساط کے الٹ جانے، جس کی جدائی بہت سے "نقوش" کے مٹ جانے اور جس کی وفات بہت سی جگہوں میں "خلا" پیدا کر دینے کا باعث ہوتی ہے۔ ایسی ہی نادرۂ روزگار شخصیتوں میں استادِ محترم فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد (رحمۃ اللہ علیہ) کی ذاتِ گرامی بھی تھی۔

فما کان "فخر" ھلکہ ھلک واحدٍ
ولکنہ بنیان قومٍ تھدما

(عبدۃ ابن الطیب کی مدوح سے معذرت کرتے ہوئے)

(یعنی مولانا فخر الدین کی وفات کسی ایک شخص کی موت نہیں ہے بلکہ ایک قوم کی قوم گویا ختم ہو گئی۔ مفہوم)

مولانا سے میری واقفیت کا آغاز

مولانا مرحوم کی عزت و عظمت کے اثرات خادم کی لوحِ قلب پر بچپن ہی سے پڑنا شروع ہو گئے تھے کیونکہ گھر کی فضا کو مولانا کے تذکروں سے معمور اور قبلہ والد صاحبؒ کو موصوف کے محاسن میں رطب اللسان پایا۔ والد صاحبؒ (مولانا قاری حمید الدین سنبھلی) جنہوں نے پہلے اپنے وطن، پھر مدرسہ شاہی مراد آباد اور آخر میں دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ جہاں دورۂ حدیث حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے ۱۳۳۴-۳۵ھ میں پڑھا۔ حضرت مولاناؒ سے شرف تلمذ کے ساتھ، غایت درجہ عظمت و محبت کا تعلق بھی رکھتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت نے ہمارے مکان کو کئی بار شرفِ قدوم بھی بخشا، احقر نے سب سے پہلی بار غالباً ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں اپنے پرانے مکان کی نشست گاہ میں ہی دیکھا۔ اس کے علاوہ والد صاحب کے ہمراہ مراد آباد حاضر ہو کر بھی بارہا شرف نیاز حاصل کیا۔ والدۂ محترمہ مرحومہ کا وطن مراد آباد ہونے کی وجہ سے اکثر وہاں جانا ہوتا تھا۔

پوری واقفیت کا موقع

حضرت مولانا کی عظمت کے یہ ابتدائی دھندلے اور ناپختہ خاکے ۱۳۷۷ھ کے اوائل میں حضرت ممدوح کو دار العلوم دیوبند جیسے گہوارۂ علوم کی عظیم ترین مسند پر جلوہ افروز دیکھ کر اور اس مسند کا حق ادا کرنے والا پاکر صاف، پختہ تر اور نہ مٹنے والے نقوش بن گئے۔

اس تصور نے شرک کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی۔ کیونکہ انسانوں کی طرح وہ بھی عاجز بندے ثابت ہو گئے۔ ان کا کام وحی لانا، ارواح قبض کرنا، اعمال لکھنا، جہاد میں مسلمانوں کی نصرت و امداد کرنا، خدا تعالٰی کی عبادت کرنا اور اس کے حکم کو بجا لانا ہے۔

۳۔ ایمان بالرُّسل

توحید کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ رسالت ہے جس طرح اعتقاد کی جہت میں توحید اصل دین ہے اسی طرح اتباع کی جہت میں رسالت اصل دین ہے۔ رسالت کے اعتقاد کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف عقائد اور عبادات میں بلکہ زندگی کے تمام عملی مسائل میں اس طریقہ کی پیروی کی جائے جس پر خدا کے رسُول چلے ہیں کیونکہ خدا نے جس علم اور نورِ بصیرت سے ان کو بہرہ ور فرمایا تھا۔ اس سے غلط اور صحیح طریقوں کا فرق یقینی طور پر انہیں معلوم ہو جاتا تھا اس لیے وہ جو کچھ ترک یا اختیار کرتے تھے اور جو کچھ حکم دیتے تھے وہ سب خدا کی طرف سے تھا اسی لیے اللہ تعالٰی نے تمام دوسرے لوگوں کا اتباع ترک کر کے صرف انبیاء کے اتباع کا حکم دیا ہے ارشادِ خداوندی ہے۔

"اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ بحکمِ خدا اس کی اطاعت کی جائے"

دوسری جگہ قرآنِ حکیم میں اللہ کے ساتھ رسولوں پر ایمان لانے کا حکم اس طرح دیا گیا ہے۔

"پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ اگر تم ایمان لائے اور پرہیزگاری اختیار کی تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہے"

ایمان لانا تو ہر نبی اور رسول پر ضروری ہے البتہ اتباع و اطاعت صرف آخری رسول جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرض ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:-

"اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو"

دوسری جگہ فرمایا:

"اللہ کی اطاعت کرو۔ اور رسول کی اطاعت کرو"

۴: ایمان بالکتب

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے اسلام ان تمام کتابوں کو ماننے کا حکم دیتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کے رسولوں پر نازل کی گئی ہیں جس طرح تمام رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح تمام کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں کہا گیا ہے۔

"اور پرہیزگار وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو تیری طرف اتاری گئی اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے اتاری گئی تھیں"

لیکن ایمان کے بعد جہاں سے عملی طور پر اتباع کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں دوسری کتابوں سے تعلق منقطع کر کے صرف قرآن کے ساتھ تعلق رکھنا ضروری ہے۔

اس لیے کہ:-

۱۔ وہ تغیر و تبدل سے محفوظ نہیں ہیں

۲۔ ان کی تعلیمات میں محدود نسلی قومیت کا اثر نمایاں ہے۔

۳۔ وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی نہیں کر سکتیں۔ جبکہ قرآن مجید ان تینوں خامیوں سے پاک ہے۔

۵۔ ایمان بالیوم الآخر

یوم آخر سے مراد موت کے بعد کی زندگی ہے قرآن مجید کا شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہو جو اس دوسری زندگی کے ذکر سے خالی ہو طرح طرح سے اس کو ذہن نشین کیا گیا ہے اس کی صداقت پر دلائل قائم کئے گئے ہیں۔ اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اس کی اہمیت جتائی گئی ہے اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو شخص اس اُخروی زندگی پر ایمان نہیں لاتا۔ اس کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں

چنانچہ فرمانِ باری تعالٰی ہے۔

"جن لوگوں نے ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے اعمال ضائع ہو گئے"

اِنفرادی تربیت

اسلامی تہذیب کا اصل مقصد ایک صحیح اجتماعی نظام قائم کرنا ہے مگر ایسی سوسائٹی کا وجود میں آنا ممکن

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

واقعات و تاثرات

فخرُ المحدّثین

حضرت مولانا السیّد فخر الدّین احمد رحمۃ اللہ علیہ

(مولانا برھان الدین سنبھلی) استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

یُوں تو اس دنیا میں ہر آنے والا جانے کے لیے ہی آتا ہے اور وقتِ مقررّہ پر چل دیتا ہے، مگر یہ روایت بھی قائم ہو گئی ہے کہ آمد کے وقت لبوں پر تبسّم، چہروں پر خوشی کے آثار اور رخصت کے وقت چہرے غمگین، آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کسی کے آنے پر خوشیاں منانے والے ہی جانے پر آنسو بہانے والے ہوتے ہیں اور کوئی اس طرح آتا ہے کہ آتے وقت خوشی میں سرمست بہت تھوڑے، مگر جاتے وقت رنج و غم، کرب و الم سے بے حال ایک عالم ہوتا ہے۔ اور جانے والے کی ذات، ایک عارف ربانی کی نصیحت ؎

"آں چناں زی کہ وقت مردن تو
ہمہ گریاں شوند تو خنداں"

کا عملی نمونہ اور آیتِ قرآنی "وجوہ یومئذٍ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ"۔ کا مصداق ہوتی ہے۔

یہ "رتبہ بلند" ہر ایک کو کہاں ملتا ہے ہزاروں۔ بلکہ لاکھوں کروڑوں میں کوئی ایسا ہوتا ہے جس کی موت " عالم کی موت"، جس کا رخصت ہونا ہزاروں دلوں کے صبر و سکون رخصت ہو جانے، جس کا چلا جانا بہت سی مَسندوں کے سُونا ہو جانے، جس کا انتقال پوری بساط کے الٹ جانے، جس کی جُدائی بہت سے "نقوش" کے مٹ جانے اور جس کی وفات بہت سی "جگہوں" میں "خلا" پیدا کر دینے کا باعث ہوتی ہے ــــ ایسی ہی نادرۂ روزگار شخصیتوں میں استادِ محترم فخر المحدّثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد (رحمۃ اللہ علیہ) کی ذاتِ گرامی بھی تھی۔

فما کان "فخر" ھلکہ ھلک واحدٍ
ولکنہ بنیان قوم تھدما

(عبدہ ابن الطیب کی رُوح سے معذرت کرتے ہوئے)

(ط مولانا فخر الدین کی وفات کسی ایک شخص کی موت نہیں ہے بلکہ ایک قوم کی قوم گویا ختم ہو گئی ـــ مفہوم)

مولانا سے میری واقفیت کا آغاز

مولانا مرحوم کی عزت و عظمت کے اثرات خادم کی لوحِ قلب پر بچپن ہی سے پڑنا شروع ہو گئے تھے کیونکہ گھر کی فضا کو مولانا کے تذکروں سے معمور اور قبلہ والد صاحب رح کو موصوف کے محاسن میں رطب اللسان پایا۔ والد صاحب رح (مولانا قاری حمید الدین سنبھلی) جنہوں نے پہلے اپنے وطن، پھر مدرسہ شاہی مرادآباد اور آخر میں دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ جہاں دورۂ حدیث حضرت مولانا علاّمہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے ۱۳۴۴-۴۵ھ میں پڑھا۔ حضرت مولانا رح سے شرفِ تلمذ کے ساتھ، غایت درجہ عظمت و محبت کا تعلق بھی رکھتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت نے ہمارے مکان کو کئی بار شرفِ قدوم بھی بخشا، احقر نے سب سے پہلی بار غالباً ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں اپنے پرانے مکان کی نشست گاہ میں ہی دیکھا۔ اس کے علاوہ والد صاحب کے ہمراہ مرادآباد حاضر ہو کر بھی بارہا شرفِ نیاز حاصل کیا۔ والدۂ محترمہ مرحومہ کا وطن مرادآباد ہونے کی وجہ سے اکثر وہاں جانا ہوتا تھا۔

پُوری واقفیت کا موقع

حضرت مولانا کی عظمت کے یہ ابتدائی دھندلے اور ناپختہ خاکے ۱۳۷۷ھ کے اوائل میں حضرت ممدوح کو دارالعلوم دیوبند جیسے گہوارۂ علوم کی عظیم ترین مسند پر جلوہ افروز دیکھ کر اور اس مسند کا حق ادا کرنے والا پا کر صاف، پختہ تر اور نہ مٹنے والے نقوش بن گئے۔

حضرت شیخ الاسلام مولینا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ نے اوائل ذیقعدہ ۱۳۷۶ھ میں معمول کے مطابق دورۂ حدیث کی جماعت کو بخاری جلد اوّل پڑھانا شروع کی۔ جس کا ایک فرد یہ حقیر راقم سطور بھی تھا کچھ ہی دنوں بعد، جلد ثانی بھی عصر بعد ہونے لگی (جس میں کتاب المغازی کا پڑھانا اور اس کے درمیان خاص کیف و سرمستی کا عالم طاری ہونا۔ نیز اسمائے بدریین کے بعد دعا کا رقت انگیز منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے معلوم ہوتا ہے)

اس وقت یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ ایسی ابتداء ہے جس کی انتہا نہ ہوگی اور حضرت مدنیؒ کے خزینہ علوم سے براہ راست فیضیاب ہونے والی یہی آخری — خوش قسمت یا بدقسمت — جماعت ہے اور اسے بھی پورے سال استفادہ کا موقع نہ مل سکے گا۔ لیکن لیل و نہار کی گردش نے دو مہینے کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ حضرتؒ کی علالت — نہ ختم ہونے والی علالت — کا سلسلہ شروع ہوگیا اور جوں جوں دن گذرتے گئے مرض شدت اختیار کرتا گیا۔ تاآنکہ اواخر محرم ۱۳۷۷ھ میں اس پیکر عزم و استقلال کی ہمت بھی جواب دینے لگی۔ اس پر بھی طلباء کا حرج گوارہ نہ تھا لیکن مخلصین کے پیہم اصرار کے بعد پڑھانا بند کیا۔ البتہ سبق بند ہونے کے حرج کا شدید احساس مقتضی ہوا کہ کسی اہل کو اس مسند پر بٹھایا جائے۔

دارالعلوم دیوبند کے طلبہ و اساتذہ، حضرت مولانا فخرالدین احمدؒ سے ناآشنا نہ تھے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس سے قبل حضرت مدنیؒ اپنی اسیری اور الیکشنی مصروفیت کے دوران دو مرتبہ حضرت مولاناؒ کو اپنا جانشین بنا چکے تھے اور مولانا نے اپنی صلاحیتوں کا سکہ جما دیا تھا۔ طلبہ میں تذکرہ قدرتی طور پر مولانا کا ہونے لگا۔

انہی تمام باتوں سے اندازہ ہو چلا تھا کہ اس پر وقار مسند کی زینت کون بننے والا ہے چنانچہ اندازہ صحیح نکلا اور کچھ ہی عرصہ بعد حضرت مولاناؒ کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا پھر ایک دن وہ آیا کہ اس مسندِ علم و تقویٰ کے شہ نشیں وہی تھے.....

غالباً ماہ صفر ۱۳۷۷ھ کے اواخر میں باب ما ذکر فی ذھاب موسیٰ فی البحر الی الخضر۔ سے بخاری پڑھانا شروع کی مدارس کی دنیا سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ مدرس کے لیے تدریس کے ابتدائی دن کیسے صبرآزما اور اس کی قسمت کے لیے کتنے فیصلہ کن ہوتے ہیں، اور پھر مدرسہ بھی وہ جس کی عظمت و شوکت کا ڈنکا اس کے دامنِ فیض میں تربیت پانے والے ہزارہا علماء و فضلاء، چار دانگ عالم میں تقریباً ایک صدی سے بجا رہے تھے اور جس کے افق سے کیسے کیسے آفتاب علم اور ماہتاب تقویٰ نمودار ہو ہو کر عالم کو منور کر رہے تھے اور جانشینی بھی کس کی؟ اس ذاتِ گرامی کی جس کے دریائے علم و فضل اور بحرِ تصوف و "احسان" سے عرب و عجم سب ہی سیراب ہوئے اور ہو رہے تھے۔

ہرچند کہ مولاناؒ کوئی غیر معروف نہیں تھے لیکن جماعت کے طلبہ تو نئے ہی تھے۔ براہِ راست تجربہ مولانا کے بارے میں نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ جیسا کہ مدارس کے طلبہ کی عادت ہوتی ہے کہ شروع میں ہر مدرس کی گویا "نبض دیکھتے" اور اسے اچھی طرح جھنجھوڑ کر "جانچتے" ہیں — حضرت استاذؒ بھی ان تمام مراحل سے بلکہ کہنا چاہیئے کہ مدرسہ کے "خار زار" سے گزرے۔ مگر اس طرح گزرے کہ دامن سے الجھنے والے کو بجز خفت و ندامت کے کچھ ہاتھ نہ آتا۔

مولانا کی علمی عظمت ایک مدرس کی حیثیت سے

اس خاص ذہن کے علاوہ بھی سوالات کرنا طلبِ علم کی راہ میں ایک ناگزیر ضرورت ہے چنانچہ اس مقصد سے بھی اکثر اہم اور بعض بہت دقیق سوالات کیے جاتے۔ مولانا ان سب کے بلا تامل ایسے انداز میں جوابات دیتے کہ "ذہنی گرہ" کھل جاتی۔ ایک دن شرکائے سبق میں سے ایک نے سوال کرتے ہوئے تفسیر کشاف اور بیضاوی میں لفظ "دین" کے ماخذ کی نشاندہی کے طور پر پیش کیا گیا حماسہ کا مشہور شعر ؎

ولم یبق سوی العدوا
ن دناھم کما دانوا

پڑھا بس کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحہ مولانا یوں نغمہ بار ہوئے ؎

صفحنا عن بنی ذھل — وقلنا القوم اخوان
عسی الایام عن یرجعن — قوما کالذی کانوا
فلما صرح الشر — فامسا وھو عریان
ولم یبق سوی العدوا — ن دناھم کما دانوا

اور اس سلسلہ کے تقریباً تمام ہی اشعار برجستہ سنا ڈالے۔ ساری جماعت غیر معمولی قوتِ حفظ کا یہ مظاہرہ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ اس لیے اور بھی تعجب تھا کہ عرصہ دراز — کم و بیش نصف صدی — سے مولاناؒ حدیث ہی پڑھاتے آ رہے ہیں، ادب وغیرہ سے زیادہ اشتغال نہیں رہا۔

علامہ انور شاہؒ کا اعتماد اور ان کا رنگ

کبھی تحدیثِ نعمت کے طور پر خود فرما دیا کرتے۔ "بھائی! حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی میرے حافظہ پر اعتماد تھا۔" شاہ صاحبؒ سے مراد محدث العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری ہوتے جن سے حضرت مولانا کو تلمذ بھی حاصل تھا، اور غایت درجہ تعلق رہا تھا شاہ صاحبؒ کا تذکرہ کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ مولانا کو لذت محسوس ہو رہی ہے۔ اور زبان چٹخارے لے رہی ہے۔ درس میں بھی ان ہی کا رنگ غالب رہتا۔ آپ کی تحقیقات کا تقریباً روز ہی ذکر فرماتے۔ حالانکہ بخاری شریف، مولانا نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے (۲۸ - ۱۳۲۷ھ میں) پڑھی تھی۔

یہاں یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ شاہ صاحبؒ کا حافظہ محیر العقول حد تک قوی تھا بعض اہل علم کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کہا کرتے تھے: "حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا حافظہ دیکھ کر ہی سلف کے غیر معمولی حافظہ کے واقعات کی تصدیق ہوئی۔ ورنہ ان کے (محدثین وغیرہ کے)..... بارے میں منقول حکایات پر یقین آنا مشکل ہوتا" (مولانا عبدالسلام صاحب ندوی قدوائی نے ایک مجلس میں مختلف علوم کے ایک بڑے اسکالر، خصوصاً عربی ادب و تاریخ کے ممتاز فاضل حضرت مولانا علی میاں صاحب کے پھوپھا مولانا سید طلحہ حسنیؒ کا یہ مقولہ نقل کیا۔)

مولانا سبق پڑھاتے ہوئے صحیح بخاری — خصوصاً جلد اوّل کے — رموز و نکات خاص طور پر تراجم الابواب کی موشگافیاں نہیں واقعی۔ حکمتیں اور مصلحتیں اس طرح بیان فرماتے کہ خیال ہونے لگتا کہ خود مصنف ہی کتاب پڑھا رہا ہے بلکہ کبھی تو ذہن اس طرح (غلط یا صحیح) سوچنے لگتا کہ امام بخاریؒ بھی شاید ان سے بہتر نہ پڑھاتے۔ ان کے درس میں صرف بخاری ہی نہیں بلکہ دوسری کتبِ حدیث ان کی متداول اور غیر متداول شروح، نیز اکابر دیوبند کی تحقیقات کا عطر کشید کیا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ ان کے درس بخاری کی تقریر — ایضاح البخاری — کے مطبوعہ حصوں سے ہر ایک کر سکتا ہے۔

حدیث پر تصنیفات

علاوہ ازیں صحیح بخاری پر مولانا کی دو مستقل تصنیفیں بھی۔ القول الفصیحؒ اور القول النصیح — عربی زبان میں موجود ہیں حدیث ہی کے موضوع پر النور الفائقؒ اور اربعینؒ بھی مولانا کے رشحات قلم کے مجموعے ہیں ان سے بھی مولانا کے رسوخ فی العلم اور دقتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔

ایک ممتاز وصف

مولانا کی ایک خصوصیت جس میں ہمعصر اکثر علماء سے ممتاز تھے، زبان کی فصاحت و بلاغت اور شیرینی بھی تھی۔ کم سے کم احقر کے لیے اس وقت طبقۂ علماء کے بارے میں یہ پہلا تجربہ تھا۔ جب لب کشا ہوتے تو معلوم ہوتا کہ سچ مچ پھول جھڑ رہے ہیں۔ ان کے نرم و نازک گلابی ہونٹوں سے نکلتے الفاظ بکھرتے موتی نظر آتے۔ شگفتہ جبیں گلگوں چہرہ اور اس پر نورانی سفید داڑھی اس منظر کو اور ایسا بنا دیتے کہ سبحان اللہ! ایک سماں بندھ جاتا۔ جس میں سامع ہمہ تن مستغرق ہو جاتا کبھی کسی عبارت کے ترجمہ کی ضرورت پیش آجاتی تو ایسا بامحاورہ کرتے کہ لطف آ جاتا اور مولانا کی عربی، اردو دونوں زبانوں سے گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا۔ لگے ہاتھوں ایک مثال بھی سن لیجئے۔!

ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی مشہور روایت جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے:

انما انا بشر وانکم تختصمون الیّ ولعل بعضکم ان یکون "الحن" بحجتہ من بعض فاقضی لہ علیٰ نحو ما اسمع منہ...... الخ میں مذکور لفظ "الحن" کا ترجمہ "چرب زبان" کیا تھا

کاملین فن سے تلمذ

حضرت مولانا نے جس طرح علوم عالیہ اپنے وقت کے ماہر اور چوٹی کے اساتذہ حضرت شیخ الہندؒ علامہ کشمیریؒ وغیرہما — سے حاصل کیے، اسی طرح علوم آلیہ — منطق، فلسفہ وغیرہ بھی اس دور کے ماہر فن مولانا ماجد علیؒ (استاذ العلماء مولانا لطف اللہ کے ممتاز شاگرد) سے اس طرح حاصل کیے کہ اپنے استاد کے ساتھ سایہ کی طرح ہر جگہ رہے چنانچہ استاد کی ہمراہی میں گلاؤٹھی مدرسہ حسین بخش، مدرسہ عربیہ فتحپوری دہلی میں تحصیل علم کی غرض سے برسوں رہے مگر ادھر مدت ہوئی کہ ان

فنون سے ربط گویا چھوٹ چکا تھا اور فنِ حدیث ہی کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتے ہوئے بزبانِ حال کہتے ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد — حکیم سید عالم صاحبؒ سے حاصل کی۔

بیعت و اجازت

ان علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی کا فیضان بھی مولانا نے حضرت شیخ الہندؒ سے حاصل کیا اور مولانا کے صاحبزادہ مولوی حکیم معین الدین صاحب کی روایت کے مطابق اجازت بیعت بھی مرحمت ہوئی مگر کسی کو بیعت نہیں کیا۔

درس و تدریس کی ابتدا اور انتہا

تحصیل علم سے رسمی فراغت (۱۳۲۸ھ) کے بعد بھی مادرِ علمی (دارالعلوم) نے اس ہونہار فرزند کو اپنے آغوش میں ہی رکھا۔ چنانچہ پورے ایک سال یہاں کی دولت یہیں لٹانے میں مشغول رہے۔ پھر جب مربیوں نے تجربہ کرکے دیکھ لیا کہ یہ لائق فرزند میراثِ نبوی اور تراثِ قاسمی تقسیم کرنے کا ہر طرح اہل ہے تب مدرسہ شاہی مراد آباد کے امینوں کو (۱۳۲۹ھ میں) یہ قیمتی امانت سپرد کی کہ یہ مدرسہ بھی قاسم العلوم والخیرات کے چشمۂ فیض سے نکلی ہوئی نہر ہے۔ اگلے ہی سال (۱۳۳۰ھ میں) اس درسگاہ کے سب سے بڑے منصب — شیخ الحدیثی — پر فائز ہوئے (یہ اور اس کے علاوہ اکثر سنین مولانا کے صاحبزادے کے مکتوب سے ماخوذ ہیں۔ جو موصوف نے احقر کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمایا:) اور وہاں علوم و معارف کے وہ دریا بہائے کہ یہ معمولی نہر بڑے بڑے دریاؤں کی ہمسری کرنے لگی۔ اور مکین کے ساتھ مکان کی عظمت کا پھریرا بھی آسمانوں میں اڑنے لگا۔ تقریباً نصف صدی تک یہ علم و فضل کا آفتاب شاہی کے افق پر ہی چمکتا رہا تا آنکہ ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء آیا اور وہ حالات رونما ہوئے جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے اس وقت گہوارہ علوم (دارالعلوم) کے اس زمانہ کے سب سے بڑے مربی، حضرت الاستاذ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ امانت شاہی سے واپس لی ... اور اس عظیم جگہ رکھی جہاں وہ خود اپنے مربیوں کے حکم سے بیٹھے ہوئے تھے۔

مولانا مدنیؒ سے ربط محبت

جس طرح انتخاب کرنے والے کو اپنے "جانشین" پر اعتماد اور حسن انتخاب پر ناز تھا۔ اسی طرح یہ بھی اپنے جوہر شناس محسن سے بے انتہا ربط و تعلق رکھتے تھے، ایسا کہ — استاذوں کے علاوہ کسی سے بھی نہ تھا اور آخر میں تو یہ تعلق محبت اور عظمت کی تمام حدیں پار کر گیا تھا تذکرہ کرتے تو لفظ لفظ سے عقیدت و محبت ٹپکتی۔ بلکہ بارہا یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ادھر زباں پر ان کا ذکر آیا اور ادھر آنکھوں میں سیلِ رواں جاری ہوا۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ (جمادی الاول ۱۳۷۷ھ، دسمبر ۱۹۵۷ء) کے بعد پہلے سبق کا منظر تو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نہ دل قابو میں ہے نہ آنکھ اور زبان بے چاری تو یارا ہی کیا تھا کہ وہ حرکت کرتی۔ گھنٹوں — بلا مبالغہ — اسی کیفیت میں ڈوبے، روتے، رلاتے، گزار دیئے — اور یہ محبت و عظمت بلا وجہ نہیں تھی ہم عصروں سے تو یوں بھی بشکل عقیدت ہو جاتی ہے بلکہ اس کے بہت سے وجوہ تھے جن میں سے بعض کا تذکرہ سبق میں بھی فرمایا۔ اسی ذیل میں ایک مرتبہ نجیب آباد میں پیش آنے والے حیرت ناک واقعہ کا ذکر نہایت مؤکد قسم کھا کر فرمایا جس کا تعلق تصوف و تقرب کے بعض خاص حالات سے تھا۔

اور یہ احترام محض ولایت و کرامت ہی کا رہین منت نہیں تھا بلکہ حضرت مدنیؒ کے علم کی وسعت، نظر کی دقت اور تحقیق کی ندرت کا اعتراف بھی اس کا سبب تھا اسی بنا پر موصوف کے علمی اقوال اور ان کی تحقیقات کو بہت اہمیت دیتے اور ان کا وزن محسوس کرتے حالانکہ اگر معاصرین میں کسی اور کا قول نقل کیا جاتا اور مولانا کو اس سے اتفاق نہ ہوتا تو فرما دیا کرتے۔ "ھم رجال ونحن رجال" (غالباً یہ الفاظ امام ابو حنیفہ نے تابعین کے بارے میں ارشاد فرمائے تھے)

ایک مرتبہ احقر نے — طالب علمانہ طور پر — دریافت کیا کہ حضرت مدنیؒ کا رمضان المبارک کے مہینہ میں قیامِ لیل کا جس طرح معمول رہا ہے (یعنی جماعت کبیرہ کے ساتھ نوافل پڑھنا) کیا اس کی نظیر سلف کے یہاں بھی ملتی ہے!

مولانا نے جواب دیا:۔ "نظر سے تو نہیں گزرا — اور پھر معاً یہ بھی فرمایا: حضرت (مدنیؒ) نعم السلف تھے اور اسی قرب و تعلق کا اثر تھا کہ "جنگ آزادی" کے بارے میں اول الذکر کے خیالات کے اندر ثانی الذکر کا طرز فکر پوری طرح جھلکتا تھا اور مولانا کے سینہ میں دبی چنگاری حضرت مدنیؒ نے ایسی فروزاں کی، کہ باوجود خالص علمی ذوق کے جہاد حریت میں عملی حصہ لے کر قید و بند کے مصائب بھی، ایسے نازک بدن، حساس طبع اور پھول جیسی لطافت مزاج رکھنے والے نے برداشت کیے (۱۹۳۰ء میں مولانا جیل گئے تھے)، اسی رشتہ سے مولانا کا جمعیۃ علمائے ہند سے تعلق تادمِ آخر — کسی نہ کسی نوع کا — باقی رہا — اور آخر میں کم و بیش دس سال تک (مولانا احمد سعید صاحبؒ کی وفات کے بعد) اس کی مسند صدارت کی بھی زینت تھے۔ اس پیرانہ سالی میں "جمعیۃ" جیسی ہندوستان گیر جماعت کی سربراہی کی مشقتیں اپنے محبوب کے صاحبزادہ — مولانا سید اسعد میاں صاحب مدنی — ہی کی خاطر جھیلتے رہے۔

کریمانہ اخلاق

مولانا اپنی صاف گوئی اور صراحت پسند طبیعت کے باوجود تمام تعلق داروں، حتیٰ کہ خدام کی صف تک کے لوگوں — کی دل شکنی گوارا نہ فرماتے، ان کی دل جوئی کے لئے خود بڑی سے بڑی زحمت بطیب خاطر برداشت کر لیتے اسی افتاد طبع کی بنا پر خادم کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے سخت گرمی (جون ۱۹۵۹ء) میں سفر فرمایا اور یک شبانہ روز قیام کرکے واپس تشریف لے گئے۔ خیر اسوقت تو مولانا کی صحت اتنی گئی گزری نہ تھی۔ ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی کا واقعہ ہے کہ بعض اہلِ تعلق کی وجہ سے — ایسے ہی شدید موسم میں — بنگلور کا ڈیڑھ ہزار میل لمبا اور صبر آزما سفر کیا اس کے علاوہ بھی آئے دن قریب و بعید کے سفر کرتے ہی رہتے حالانکہ ادھر چند سالوں سے ضعف اس درجہ ہو گیا تھا کہ بات کرنے میں بھی نمایاں ہوتا تھا اور لبا اوقات ملاقات کے لیے حاضر ہونے والے — اپنی غلطی محسوس کرتے کہ آ کر کیوں زحمت بن گئے۔

خادم کا اپنے دہلی قیام کے دوران یہ معمول رہا کہ مولانا کی جب بھی تشریف آوری ہوتی — اور اکثر دہلی تشریف لایا ہی کرتے — اور پتہ چل جاتا تو کم سے کم ایک مرتبہ ضرور حاضر خدمت ہوا کرتا۔ بلکہ جب تک جمعیۃ کا مرکزی دفتر — نئی دہلی مسجد عبد النبی منتقل نہیں ہوا تھا گلی قاسم جان ہی میں رہا۔ اس وقت تک دوران قیام اکثر روزانہ حاضر ہوتا اور ہمیشہ ہی مسرت و خوشی کے ساتھ علمی فوائد بھی حاصل ہوتے۔

مولانا کو بھی انتظار رہتا اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ اپنی آمد کی اطلاع مجھے پہلے ہی کر دی — مگر ان کے آخری سفروں میں حاضری کے وقت کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا کہ یہ ملاقات اور گفتگو کہیں تکلف کا سبب تو نہیں بن گئی۔

درس حدیث کی برکت اور روحانی قوت

لیکن عجیب بات ہے کہ یہی ضعف، پیری، کمزوری و لاغری کا شکار، نحیف و جثہ، جب مسندِ درس حدیث پر بٹھا دیا جاتا تو بلبل کی طرح چہکتا نظر آتا، اب نہ آواز میں ضعف نہ حواس میں اختلال، نہ تقریر میں بے ربطی نہ علوم و معارف کے فیضان میں کمی، اس وقت گویا اُن کا رُواں رُواں، تابعی جلیل، حضرت عکرمہ کے قول "من قرأ القرآن لم یرد الی ارذل العمر حتی لا یعلم بعد علم شیئاً" کی صداقت پر شہادت دیتا نظر آنے لگتا۔ (جو بھی قرآن مجید سے وابستگی رکھے وہ بڑھاپے میں بالکل حواس کھو نہیں بیٹھتا) (مفہوم)

حدیث اور علوم دینیہ کے اشتغال کی برکت اور صاحب حدیث کی کرامت اور روحانی قوت پر اس سے بڑھ کر اور کون سی دلیل ہوگی؟ جیسے ہی سبق ختم ہوتا۔ بس مولانا، مضغۂ گوشت اور ہڈیوں کا بے جان ڈھانچہ نظر آنے لگتے اور زبانِ حال یہ کہتی۔ ؏ ما زندہ ازانیم کہ آرام نگیریم

خاتمۂ باب

ہاں ہر سبق پڑھانے کا سلسلہ بند نہیں کیا تا آنکہ ایک دن وہ آیا کہ مولانا پر غشی طاری ہو کر زبان بند ہو گئی ایسی حالت ہو جانے کے بعد باصرار مولانا کو مراد آباد وطن ثانی۔ اصل وطن ہاپوڑ اور مولد اجمیر ہے / بھیجا گیا۔ یہاں پہنچ کر چالیس دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ غذا تقریباً بند ہو گئی۔ صاحبزادہ محترم کے مکتوب میں آخری دنوں کا معمول یہ لکھا ہے:۔ بمشکل ۳-۴ چمچے صرف شلجم یا مولی کا شوربا بغیر گھی اور مصالحہ

کے نوش فرمائیے۔ یرقان کا بہت زور رہا حکیم محمد صدیق صاحب بریلوی کا علاج رہا۔ مگر افاقہ نہ ہوا۔

(وفات سے ایک دن قبل) ۱۹ صفر ۱۳۹۲ھ کو بعد نماز مغرب بہت شدید جاڑا چڑھا۔ بخار کی شدت سے قلب بہت متاثر ہوا…. مگر اس میں صرف اللہ اللہ کا ورد زبان پر رہا۔ بار بار غفلت ہو جاتی تھی مگر جب بھی ہوش آتا اللہ اللہ فرماتے…. گھر اور دنیا سے بے تعلق تھی۔ بات چیت کم فرماتے تھے۔ آب زمزم برابر نوش فرماتے جب تک طاقت رہی کھڑے ہوکر نماز پڑھی اس کے بعد بیٹھ کر….. آخری ہفتہ میں ضعف و نقاہت کی وجہ سے بیٹھنا بھی مشکل ہوگیا تھا تو لیٹے لیٹے نماز ادا فرماتے نماز سے فارغ ہوکر قرانِ پاک کی تلاوت کرتے۔

غور فرمائیے! حالتِ صحت و اختیار میں سنتِ رسول کی تشریح کرنے والا مرض و اضطرار کی حالت میں بھی مرضِ رسول کی عملی تفسیر "وجعل یتغشاہ الکرب" کی تصویر بنا ہوا ہے۔

ماہ صفر ۱۳۹۲ھ کی بیسویں کو سفرِ آخرت ہوا ٹھیک اسی وقت قیدِ زندگی سے رہائی پائی جس وقت درسِ زندگی سے فراغت ہوتی[1] اور بالآخر شب میں پوری نیند قال الرسول کی نوا سنجی اور سحر خیزی کی بدولت نہ سونے والا، تھکا ماندہ مسافر "نم کنومۃ العروس" کی لوریاں دے کر آرام سے سلایا جا رہا ہے۔

[1] مولانا کی وفات ۱۲ بجے شب کے قریب ہوئی موسم گرما میں عام طور پہ اسی وقت سبق ختم ہوتا تھا اور قرآن مجید میں رسول کی دعوت کو "حیاۃ" کہا گیا ہے… اذا دعاکم لما یحییکم (انفال)۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ واجعل لہ فی الفردوس من الدرجات العلی۔ صبح ہوتے ہی یہ روح فرسا خبر۔ ہوا کے دوش پر۔ سارے عالم میں پھیل گئی مگر کیا کہیئے کہ لکھنؤ پہنچتے پہنچتے۔ ایٹمی دور میں بھی — ۱۲ گھنٹے لگ گئے۔ احقر نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں بارہ بجے دن کے قریب اس زبان سے یہ خبر سنی جس نے صدہا علماء و مشائخ کے تذکرے سنا کر قلوب کو گرمایا اور روح کو تڑپایا ہے۔

سنتے ہی لکھنؤ سے مراد آباد جانے والی پہلی گاڑی کے سہارے ساڑھے نو بجے شب کے بعد "افتاں و خیزاں" سید خاں کے گھر پہنچا۔ جہاں ادھر پندرہ سال کے اندر دو جانے کتنی بار جانا ہوا تھا مگر اب کی مرتبہ یہ جانا پہلے سے بالکل مختلف تھا۔ آج سے قبل اس گلی میں ایک عالم باعمل، ایک فاضل بے بدل، حسنِ صورت و سیرت کے جامع شستہ لباس میں شگفتہ چہرے کی کشش یہاں کھینچ لایا کرتی تھی۔ اور جب تک قوت تھی وہ سب سے پہلے معانقہ (اس شارحِ حدیث ہی کے عمل سے "معانقہ" کی حقیقت بھی معلوم ہوئی) فرما کر آنے والے کا دل بڑھاتے۔ اس کے بعد دوسرے میزبانی کے لوازم مہیا فرماتے۔ مگر آہ! آج اس گلی میں منوّر و بارونق چہرہ کی جگہ بے رونقی کے تاریک سائے، بابرکت، مسکراتی ہستی کی جگہ ان کے لائقِ احترام فرزندوں کے اداس چہرے دیکھے۔ رات کا معتدبہ حصہ اس….. سے تذکرے سننے کے بجائے اس….. کے تذکرے سننے میں گذرا۔ صبح ہوئی تو اس کی عارضی آرامگاہ سے دائمی آرامگاہ پہنچا۔ وہاں مٹی کے ایک ڈھیر کے سوا کیا نظر آتا۔ مگر اس کے نیچے چھپے خزانے کو چشمِ تصور نے اس طرح دیکھا کہ اس کی کتابِ زندگی کا ایک ایک ورق آنکھوں کے سامنے الٹنے لگا۔ بس تھوڑی دیر ادعیۂ ماثورہ اور آیاتِ قرآنی پڑھ کر باحسرت و یاس واپس آگیا۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مولانا کا سن ولادت ۱۳۰۷ھ ہے۔ تاریخی نام مختار اللہ تھا۔

[1] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس حضور کی وفات کا حال بتاتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "آپ مرض کی شدت سے بیہوش ہو ہو جاتے" آخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس کا دھڑکا مدت سے لگا ہوا تھا۔ ان ما تحذرین فقد وقع

ماہانہ مجلسِ ذکر

انشاء اللہ یکم فروری بروز اتوار خضرا مسجد سمن آباد لاہور میں منعقد ہوگی۔ دعوت عام ہے۔

تعارف و تبصرہ

تبصرہ کے لیے کتاب کی دو جلدیں دفتر میں آنا ضروری ہیں (مدیر)

درس ترمذی جلد اوّل

تقریر: مولانا محمد تقی عثمانی
مرتبہ: مولانا رشید اشرف
صفحات: ۵۲۷
قیمت: پچاس روپے ۵۰/-
ملنے کا پتہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

ہمارے فاضل دوست مولانا محمد تقی عثمانی ایک علمی اور دینی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں ان کے دادا بزرگوار مدتوں دارالعلوم دیوبند جیسی مرکزی درس گاہ میں فارسی کے استاذ رہے اور ان کے والد بزرگوار مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ مدت تک اس درس گاہ کے مفتی رہے ان کا دور افتاء بڑا تابناک تھا اور پھر تقسیم ملک کے بعد وہ کراچی آگئے۔ اور یہاں ایک عظیم الشان دارالعلوم کے ساتھ افتاء کے میدان میں ملت کی زبردست رہنمائی کی۔ تقی صاحب نے علم و شرافت کے اس گہوارے میں تربیت پائی۔ اور الحمد اللہ کہ اپنی سعادت مندی اور عالی حوصلگی کے تحت بڑا مقام حاصل کر لیا۔ اس ذہین و فہیم نوجوان عالم دین نے تھوڑے ہی عرصہ میں اور عین بھرپور جوانی کے زمانہ میں جو دینی اور علمی کام کیے وہ ہم جیسے علم و عمل سے تہی دامن اور تساہل پسند لوگوں کے لیے ایک نشانِ راہ ہیں — ابھی حال ہی میں جو کتاب سامنے آئی ہے وہ موصوف کی ان درسی تقاریر کا مجموعہ ہے جو آپ نے اپنے عظیم دارالعلوم میں طلبا رِ حدیث کو فن حدیث کی معروف و مشکل کتاب ترمذی کے درس کے دوران کیں۔ اہلِ علم اور طلبہ جانتے ہیں کہ حدیث کا فن اپنی وسعت کے اعتبار سے کتنا عظیم فن ہے اور عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ کتنا نازک؟ کیونکہ اس کی نسبت اس ذاتِ قدسی صفات کی طرف ہے، جس کے معاملہ میں احتیاط کے پیش نظر بڑے بڑوں کے پتے پانی ہو جاتے تھے —

موصوف دس برس سے اس کتاب کا درس دے رہے ہیں۔ اور وہ لوگ جنھوں نے ان سے علمی استفادہ کیا ہے انہوں نے اس ناکارہ سے ملاقاتوں کے دوران ان کی تدریس کی بے حد تعریف کی۔ اب یہ کتاب سامنے آئی تو سرسری مطالعہ کے دوران ہی انکشاف ہوا کہ یہ بڑی معرکہ کی چیز ہے اور طلبہ کے لیے ایک گرانقدر تحفہ — اس کی ترتیب کا سہرا مولانا رشید اشرف کے سر ہے جو موصوف کے خواہر زادہ ہونے کے ساتھ آپ کے شاگرد ہیں اور ذی استعداد شاگرد! انہوں نے ایک تو اپنی تعلیم کے زمانہ کی ضبط شدہ تقریر کو سامنے رکھا اور پھر بعد کے سالوں کے طلبہ سے تحریری یادداشتیں حاصل کیں اور خود مولانا المحترم سے ان کی یادداشتیں حاصل کیں۔ اور اس سارے علمی مواد سے یہ گلدستہ تیار کیا جس کی پہلی جلد سامنے ہے۔ مرتب موصوف نے حوالے کے طور پر احادیث کی تخریج پر خوب خوب محنت کی اور اصل متن سمیت حوالے کو نقل کیا نامکمل حوالے مکمل کیے اور اپنی طرف سے قیمتی حواشی کا اضافہ کیا۔ اصل کتاب میں ابواب الطہارت اور ابواب الصلوٰۃ کا بڑا حصہ شامل ہے۔ ہر ہر مسئلہ پر بڑی واضح اور منقح بحث ہے اور نفس حدیث کی تفہیم کی بھرپور کوشش کی گئی ہے تاکہ طلبار نفس متن کو زیادہ سے زیادہ سمجھ سکیں اور اصل فن سے ان کی مناسبت ہو جائے۔

اصل کتاب سے قبل ایک تفصیلی مقدمہ ہے جو لگ بھگ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے اس میں حدیث سے متعلق ضروری مباحث کے ساتھ حجیت حدیث اور اس ضمن میں پھیلائے گئے فتنوں اور

نظریات پر اتنی موثر اور علمی تنقید ہے کہ منکرین حدیث کی دسیسہ کاریوں کا بنا ہوا جال مکڑی کے جالے کی طرح ہوا میں اُڑ جاتا ہے اس کے ساتھ ہی تدوین حدیث صحاح ستہ کے علاوہ اہم کتب حدیث کا تعارف کتب احادیث کے طبقات احادیث کی تصحیح وتضعیف کے اصول اصحاب الحدیث اور اصحاب الرائے جیسے مسائل اور علمی مباحث سادہ آسان اور عام فہم اور دلنشیں انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ مقدمہ میں "کوفہ اور علم الحدیث" اور پھر حضرت امام الامام ابوحنیفہ قدس سرہ کا ضروری تذکرہ، تقلید پر تفصیلی گفتگو اور آخر میں صاحبِ کتاب امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حالات شامل ہیں۔ آخر میں اپنی اسانید کا ذکر ہے جو علم حدیث میں بڑی اہمیت کا حامل مسئلہ ہے اور پھر نفس کتاب شروع ہوتی ہے۔

تقی صاحب کا محققانہ ذوق اور ٹھوس علمی انداز گفتگو کو رشید اشرف صاحب نے جس طرح مرتب کیا ہے اس پر دل سے دعا نکلی۔ اللہ تعالیٰ [illegible] ترقیات سے نوازے ہماری خواہش ہے کہ اس عظیم اور گرانقدر دینی اور علمی تحفہ کو اہل علم اور طلبہ حاصل کریں۔ اور اسے حرز جاں بنائیں تاکہ وہ بھی علمی دنیا میں آگے بڑھ سکیں (علوی)

اِسلام : از حجۃ الاسلام امام غزالی قدس سرہٗ

قیمت -/۲۴ روپے
ملنے کا پتہ نذیر سنز ۴۵-اے اردو بازار لاہور

حضرت امام غزالی قدس سرہٗ کے نام نامی سے ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے۔ بلکہ غیروں کی دنیا میں بھی ہزاروں انسان آپ کی عظمت کے معترف ہیں۔ اپنی مختصر زندگی کا ایک حصّہ فلسفہ کی وادی میں گزرنے کے بعد آپ اس راہ کی طرف متوجہ ہوئے جسے تصوف وطریقت کی راہ کہا جاتا ہے اور اپنی عمر عزیز کے باقی ایام اپنی اصلاح وترقی کے ساتھ ساتھ مخلوق خدا کی خدمت میں بسر کر دیئے آپ کے عظیم علمی کام میں آپ کی تصانیف کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جن میں احیاء العلوم اور اکسیر ہدایت جیسی کتابیں شامل ہیں جو اب تک مختلف زبانوں میں بار بار چھپ کر دنیا کی اصلاح و ہدایت کا ذریعہ بن رہی ہیں انہی میں یہ کتاب بھی ہے جس کا شستہ وشگفتہ ترجمہ مولانا عاشق الٰہی نے کیا ہے۔ امام غزالیؒ نے اس میں ایک انسان کی نجات و فلاح اور دارین کی بہتری کے لیے بنیادی باتوں کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے کتاب کی سطر سطر سے ان کا اخلاص للہیت سوز دروں ٹپک رہا ہے۔ نذیر سنز جس نے تھوڑے عرصہ میں اچھی کتابوں کے ناشرین میں خاصا اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس کتاب کو بھی اچھے انداز سے چھاپا ہے امید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کریں گے۔

تذکرہ

حضرت شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانی کی ذات اور آپ کی علمی و ملی خدمات سے ایک دنیا آگاہ ہے۔ آپ کے ایک فیض یافتہ اور صاحبِ علم مولانا عبدالحلیم قاسمی نے اپنے استاد و شیخ کے حضور ہدیہ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے یہ رسالہ ترتیب دیا ہے جس میں علامہ مرحوم کی زندگی کا ضروری اجمالی خاکہ اور حکومت پاکستان کو فلاحی اسلامی ریاست بنانے کے اصول وضوابط اور قرارداد مقاصد کی منظوری کے پس منظر پر اچھی گفتگو کی ہے۔ مصروف لوگوں کے لیے یہ مختصر رسالہ بڑا وقیع ہے جو تین -/۳ روپے میں جامع حنفیہ قاسمیہ گلبرگ نمبر۲ لاہور سے دستیاب ہے۔ ہم اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔

بقیہ : احادیث الرسولؐ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس خوبی اور ان کی علمی عظمت ایک مسلّم حقیقت ہے اور اسی خوبی کے پیشِ نظر انہیں "حلال المعاقد" کہا جاتا تھا۔ رہ گیا مشاجرات صحابہ کا معاملہ، تو اس سلسلہ میں صحیح اور انسب بات وہی ہے جو نامور دینی شخصیات سے منقول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہماری تلواروں کو ان کے خون سے محفوظ رکھا تو ہمیں اپنی زبانوں کو بھی محفوظ رکھنا چاہیے۔

بات واضح اور صاف ہے کہ اختلاف ہوا جس کا بنیادی سبب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ راشد و عادل اور امام مظلوم کی مظلومانہ شہادت تھی۔ کسی صحابی کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں تھا وہ حضرات اس سے بری الذمہ تھے اس کی تمامتر ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو یہودیت کا چربہ تھے اور جن کے سازشی ذہن مجوسیت کے خمیر سے اٹھے تھے۔ امام مظلوم کی شہادت کے المناک حادثہ کے بعد ان کے قصاص کے مسئلہ پر صورت حال الجھی اور اختلافات کا قضیہ سامنے آیا۔

امت کے بعد کے افراد جنہیں اللہ تعالیٰ نے ذہن کی سلامتی سے سرفراز فرمایا تھا ہمیشہ ان واقعات پر نقد و جرح سے گریز کیا اور احتیاط کا رویّہ اختیار کیا۔ صبح قیامت میں ہر شخص سے جو سوال ہوگا وہ اس کے ایمان کا ہوگا۔ اس بات کا ہوگا کہ اعمال صالحہ کس حد تک پورے کئے اور منکرات سے کس حد تک اپنے آپ کو بچایا؟ کوئی کیا تھا اور کیا نہیں تھا؟ اس کا سوال ظاہر ہے کسی سے نہیں ہوگا ——— ہاں انبیاء علیہم السلام میں سے کسی بھی شخصیت پر ایمان نہ لانا یا ان کی توہین و تنقیص کرنا موجب ہلاکت و بربادی ہے۔ کیونکہ ان سے عقیدت و محبت کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے ہمیں پابند کیا ہے۔ یہی صحیح و سالم مسلک ہے اور اسی کے مطابق زندگی گذارنا باعثِ نجات!

اللّٰھم وفقنا لما تحب وترضیٰ۔

بقیہ : اِسلامی تہذیب کے خدوخال

نہیں۔ جب تک کہ اس کے ہر ہر فرد کو اخلاق فاضلہ کی تربیت نہ دی جائے۔ اس مقصد کے لیے اسلام نے عبادات کا ایک ایسا نظام قائم کیا ہے جن کے ذریعے انسان اخلاق رذیلہ سے بچ کر اخلاق فاضلہ کی آغوش میں آجاتا ہے اس نظام کو ارکانِ اسلام کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو پانچ ہیں :

(۱) کلمہ طیبہ (۲) اقامت صلوٰۃ (۳) زکوٰۃ (۴) روزہ (۵) حج۔

اسلام کی بنیاد ان پانچ ستونوں پر ہے جن کو اپنانے سے ایک مسلمان صحیح مسلمان بن سکتا ہے۔ کلمہ طیبہ جو توحید خداوندی اور اثبات رسالت پر مشتمل ہے۔ شرک سے بیزاری اور پیغمبرانہ اخلاق کی دعوت دیتا ہے۔ نیز غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان جدائی کا بہترین ذریعہ ہے۔ نماز اخلاق کے سنوارنے اوقات کی پابندی، ضبط نفس، فرض شناسی اور حفظانِ صحت کا بہترین ذریعہ ہے۔ زکوٰۃ تزکیہ نفس کا سبب ہے۔ بخل، حرص، اور لالچ جیسے گندے اوصاف سے نجات دلاتی ہے۔ روزہ سے روحانی قوت تیز ہوتی ہے۔ سیرت کی تعمیر ہوتی ہے صبر اور برداشت کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ حج بدنی اور مالی عبادت سے مرکب ہے۔ یہ عشق الٰہی کا عملی اظہار ہے۔ حج مساوات انسان کا بہترین مظہر ہے اور کسبِ حلال کی تعلیم دیتا ہے

اسلام کے یہ پانچ ارکان افراد کی تربیّت کا بہترین ذریعہ ہیں۔ جس معاشرہ کے افراد تربیت یافتہ ہوں گے۔ لازمی بات ہے کہ وہ معاشرہ اجتماعی حیثیت میں اسی تہذیب کا علمبردار ہوگا۔

نظامِ اجتماعی

نظام اجتماعی سے مراد انسانوں کے باہمی تعلقات اور ان کے ایک دوسرے پر حقوق و فرائض ہیں یعنی یہ جاننا کہ انسان کے تعلقات اس کے خاندان اس کے ہمسایوں، اس کے دوستوں، اس کے ساتھ رہنے اور بسنے والوں، اس کے ماتحتوں اس کے بالا دستوں خود اس کی پیروی کرنے والوں اور اس کی تہذیب کی پیروی نہ کرنے والوں کے ساتھ کس قسم کے ہیں۔

چنانچہ اسلامی تہذیب اپنے فرزندوں کو والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک، ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی، عام مسلمانوں کے ساتھ اخوت و اتحاد اور غیر مسلم اگر دین کے معاملہ میں آڑ نہیں بنتے تو ان کے ساتھ عمدہ سلوک اور عدل و انصاف کا حکم دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے اسلامی تہذیب اپنے نظام اجتماعی کے لحاظ سے لاثانی ہے۔